جون ۱۹۳۶

نگار

قیمت ۸/

نرخنامۂ اُجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۵۰ ″	۲۵ ″	۱۳ ″	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ ″	۱۳ ″	۷ ″	۴ روپیہ

۱- اُجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ ووچر یا وی، پی کے ذریعے وصولی منظور نہیں
۲- جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اُس کی رقم پیشگی یکمشت لی جائے گی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا۔
۳- اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر..... پانچ روپیہ
ششماہی ہندوستان کے اندر.... تین روپیہ
سالانہ بیرون ہند........ بارہ شلنگ
ششماہی بیرون ہند........ ۷ شلنگ

نوٹ:- رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے ۲۵- تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ بعد کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

"منیجر"

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعۂ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۲۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں۔

قیمت:- جلد اول سے ر
جلد دوم سے ر
علاوہ محصول۔

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔

جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ۔ جس میں ۳۲- افسانے سنہ ۳۳ء تک کے درج ہیں زبان قدرت بیان علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی آپکو اس مجموعہ میں نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے)
علاوہ محصول۔

نگار

شمارہ (۱)	فہرست مضامین جولائی سنہ ۳۶ء	جلد (۳۰)

ملاحظات — ۲
بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت — عبدالحق بی۔ اے۔ — ۹
تاریخ مذہب کا ایک خونیں ورق — ۱۹
ملک محمد جائسی کی پدماوت — امیر احمد علوی بی۔ اے — ۲۲
فنون ادبیہ اور حقیقت نگاری — ۳۶
آگ اور خون سے کھیلنے والا ایک انسان — ۴۳
زندہ قوموں کی داستان زندگی — ۴۷
باٹا و باٹا نگر — ۵۰
ریڈیو سننے والے — رشید احمد صدیقی ام۔ اے — ۵۳
بین الاقوامی مزدور پارٹی کی تاریخ — رسول احمد ابودھ — ۵۸
باب الاستفسار — ۶۲
مکتوبات نیاز — ۶۹
اعتبارات — ۷۲
مطبوعات موصولہ — ۷۳
منظومات — اثر — عدم — انجم — ۷۸

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد (۳۰)	جولائی سنہ ۱۹۳۶ء	شمار (۱)

ملاحظات

وہ خلیج جو کبھی پُر نہیں ہو سکتی

(اُردو ہندی نزاع)

آپ کسی قوم کا مطالعہ کیجئے، کسی نہ کسی خاص دور سے گزرتی ہوئی نظر آئے گی۔ میں نے ان ادوار کی چار تقسیمیں کی ہیں۔ ایک وہ دورِ فوز و فلاح جو اقوام مغرب کا حصہ ہو کر رہ گیا ہے اور جس میں سوائے ولولہ و نشاط اقدام و ترقی، مسرت و شادمانی کے آپ کو کوئی مغموم پہلو نہیں مل سکتا۔ ایسی قومیں ہمیشہ رجائی و تفاؤلی زندگی بسر کرتی ہیں اور ان کی حیات عبارت ہوتی ہے صرف احساس حُسن سے۔ وہ زندہ ہیں صرف ہنسنے کے لئے خوش رہنے کے لئے، یہاں تک کہ جب کوئی فرد ان کا اُٹھ جاتا ہے تو بجائے رونے اور بسورنے کے خوش ہوتی ہیں کہ اس کی یادگار جمیل قایم کرنے کا موقعہ انھیں ہاتھ آگیا (یہاں جمیل کا تعلق صرف جمال ظاہر ہی سے نہیں، بلکہ اس میں جمال فطرت و دماغ بھی شامل ہے)

اس کے بالکل برعکس انتہائی ذلت و نکبت کا وہ دور ہے جب انسان میں یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا

کروہ واقعی انسان پیدا ہوا ہے اور حیوانات سے اپنے آپ کو صرف اس لئے ممتاز جانتا ہے کہ وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے ہیں اور یہ صرف دو پاؤں پر۔

ان دونوں اَدوار کے درمیان دو دَور اور ہیں، ایک وہ جب انسان میں احساس پستی و انحطاط تو پیدا ہوجاتا ہے لیکن کوئی کیفیت اقدام وعمل کی نہیں پائی جاتی یعنی وہ ہاتھ سے کھوئی ہوئی چیز پر نوحہ و ماتم تو کرتا ہے لیکن اس کے حصول کی کوئی معقول کوشش نہیں کرتا، دوسرا دور وہ جب وہ روتا بھی ہے اور ہاتھ پاؤں بھی چلاتا ہے۔ اسوقت میرا مقصود انھیں دونوں سے بحث کرنے کا ہے جن میں سے ایک مسلمانوں سے متعلق ہے اور دوسرا ہندوؤں سے۔

میرے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کوئی نہیں کہ میں ہندوستان کے کسی اجتماعی مسئلہ پر گفتگو کروں اور اس سلسلہ میں مجھے ہندو مسلمان کی تفریق کا بھی ذکر کرنا پڑے، لیکن گزشتہ چند سال کے اندر ملک کے مذہبی احساس کی فضا ایسی گندہ ہوگئی ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا سوال اب باقی ہی نہیں۔ یا اور یہ دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں کہ وہ جو کچھ کریں مسالمت و رواداری سے قطع نظر صرف اپنے ہی نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھ کر کریں۔ اور اس میں کلام نہیں کہ مذہب کا یہ وہ ظلم ہے جس کی نظیر چنگیز و ہلاکو کے افسانہائے خونخواری میں بھی نہیں مل سکتی، اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے تاریخ انسانی کا یہ اتنا دردناک سانحہ ہے کہ مذہب کے خوں آشام دیوتا کے علاوہ کوئی اور اسے برداشت بھی نہیں کرسکتا۔

بہرحال اب یہ بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہماری کوئی اجتماعی کوشش جو ہندو مسلمان دونوں کو کسی ایک مرکز پر لاسکے کامیاب نہیں ہوسکتی ہندو، ہندو ہی رہنا چاہتا ہے اور اس احساس کے ساتھ کہ مسلمان سے زیادہ ناپاک و ملکش دنیا میں کوئی چیز نہیں اور مسلمان مسلمان ہی رہیگا اور اس ذہنیت کے ساتھ کہ ہندو سے زیادہ کافر و مردود ہستی کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی ہے دونوں کا اصل مذہب یہی ہے دونوں کا عین ایمان۔

اس میں شک نہیں کہ ایک قوم کا اپنے ذوق و تہذیب کو ترک کردینا بہت دشوار ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک ملک کے اندر جب دو قومیں دو مختلف کلچر کی پائی جائیں تو ان میں باہم قتل و خونریزی بھی ضرور ہو۔ لیکن جب مذہب ہی کو عین کلچر سمجھ لیا جائے اور مذہب ہی کو عمرانی تعلقات کی بنیاد قرار دے لیا جائے تو پھر مصالحت کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی اور خدا کی پیدا کی ہوئی اس خلیج کو کوئی انسانی ہاتھ پُر نہیں کرسکتا۔

اس حقیقت کے سمجھنے کے بعد اب آئیے میرے ساتھ اس مسئلہ پر غور فرمائیے جو یوں تو مسایل سیاست سے کوئی تعلق رکھتا ہوا معلوم نہیں ہوتا لیکن اہمیت اس نے سیاسیات ہی کی سی اختیار کرلی ہے اور وہ مسئلہ اردو ہندی کے اختلاف کا ہے۔

ہر تحریک کی طرح اس مسئلہ نے بھی بہت آہستہ آہستہ اہمیت حاصل کی ہے اور جس طرح ہر فتنہ کے آغاز میں اس کے سدِّ باب کی طرف سے بے پروائی کی جاتی ہے اسی طرح اول اول اس مسئلہ میں بھی اختیار کی گئی، لیکن اب کہ اس چشمہ نے ایک سیلاب کی صورت اختیار کر لی ہے، سوال اس کے روکنے کا تو خیر کیا ہو سکتا ہے، ہماری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ اب اس سے جانبر ہونا کیونکر ممکن ہے۔

جب سے ہندی اُردو کی نزاع شروع ہوئی اسی وقت سے باہمی مفاہمت کا خیال بھی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا لیکن اس سلسلہ میں ہندو مسلمانوں دونوں کے طریق کار میں زمین و آسمان کا فرق رہا ہے غالباً یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ ہندوؤں نے کبھی اپنے حقیقی مقصود کو ظاہر ہونے ہی نہیں دیا اور مسلمان نے جو تدبیریں اختیار کیں وہ سب جہل ولاعلمی کی حالت میں حریف کی چال کو سمجھے بغیر اختیار کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو منزل سے قریب ہوتے گئے اور مسلمان بجائے آگے بڑھنے کے اور پیچھے ہٹنے لگے۔

ارباب نظر سے مخفی نہیں کہ اول اول جس وقت اُردو کے ساتھ ہندی رسم الخط کا رواج شروع ہوا تو کم از کم صوبۂ متحدہ، پنجاب، بہار اور وسط ہند کے بالائی حصہ میں ہر پڑھا لکھا ہندو اُردو زبان بولتا تھا اور اُردو رسم الخط میں مراسلت کیا کرتا تھا۔ لیکن جونہی قومی تحریکات اور مذہبی عصبیت کے سلسلہ میں ہندی رسم خط کا سوال پیدا ہوا تو ہر چہار طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ اُردو زبان میں چونکہ فارسی عربی کے ایسے ثقیل الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں جن کا سمجھنا ہندوؤں کے لئے دشوار ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہندی کو رائج کیا جائے جو اس ملک کے باشندوں کی صحیح زبان ہے

مسلمانوں کی قوم جس نے سیاسی چالوں کے سمجھنے میں کبھی اپنی دانائی و فراست کا ثبوت پیش نہیں کیا، ہندوؤں کے اس بیان پر ایمان لے آئی اور صرف اس خیال سے کہ اُردو سے ہندوؤں کا تعلق باقی رہے، اس نے مصالحت و مفاہمت کی یہ صورت پیدا کرنا چاہی کہ اُردو زبان سے عربی فارسی کے الفاظ نکال کر اس کو زیادہ آسان بنایا جائے گویا ان کے نزدیک اصل نزاع صرف زبان سے متعلق تھی نہ کہ رسم الخط سے اور ہندو چاہتے بھی یہی تھے کہ مسلمان اُن کے حقیقی مقصود سے بےخبر رہ کر اپنی تمام تر قوت ایک ضمنی مسئلہ پر صرف کرتے رہیں، چنانچہ مسلمانوں کی مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ اُردو کو عربی فارسی الفاظ سے پاک کر کے زیادہ آسان و سہل الفہم بنانا چاہئے اور آج بھی جبکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ ہندوؤں کا حقیقی مدعا کیا ہے، یہ کوشش برابر جاری ہے — پھر اگر ہندوؤں کا مقصود واقعی یہی ہوتا کہ وہ اُردو زبان کو سہل و آسان دیکھنا چاہتے ہیں تو انھیں اس تحریک کا خیر مقدم کر کے کوئی عملی حصہ اس میں لینا چاہئے تھا، لیکن انھوں نے مطلق کوئی التفات اس طرف نہیں کیا اور آہستہ آہستہ انھوں نے اُردو رسم الخط کو ترک کر کے اس کی زبان و انشار کو بھی بدلنا شروع کیا اور ٹھیک اسی وقت جبکہ مسلمان اُردو سے عربی فارسی الفاظ نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے

ہندوؤں نے سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کرنے شروع کر دئے یہاں تک کہ وہی ہندو جو زبان کی سادگی کا دلدادہ تھا۔ لیکن اور مگر ایسے ہلکے وکثیر الاستعمال الفاظ بھی بھول گیا اور ان کی جگہ اس کو "پرنتو" زیادہ سلیس و عام فہم نظر آنے لگا۔ ہندی کے میگزین جاری ہوئے، کتابیں تصنیف ہونے لگیں، سمیلنیں (انجمنیں) قائم ہوئیں، سبھائیں رچائی گئیں، یہاں تک کہ ہندی کالجوں کی بنیاد پڑی، جن میں سے ہر ایک کا مقصد ہندوستان کی قدیم مذہبی زبان سنسکرت کو رائج کرنا ہے۔ لیکن مسلمان احمق مسلمان ہنوز یہ آس لگائے ہوئے ہے کہ ممکن ہے وہ اردو سے عربی فارسی کے الفاظ نکالکر ہندوؤں کو پھر اردو کی طرف مایل کر سکے

میں اس سے قبل بھی بارہا اس باب میں اظہار خیال کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ ہندوؤں کو مخالفت اردو زبان سے نہیں بلکہ اردو رسم خط سے ہے، چنانچہ اس کا سب سے بڑا ثبوت گاندھی جی کا وہ فقرہ ہے جو ناگپور کی بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے جلسہ میں ان کی زبان سے بے اختیارانہ نکل گیا یعنی یہ کہ:۔

"اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا، مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں"[1]

یہ ہے وہ اصل ذہنیت جو ابتدا ہی سے ہندوؤں میں کام کر رہی تھی اور جس کا اعلان انھوں نے اسوقت تک صرف اس لئے نہ کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو قصداً دھوکے میں رکھنا چاہتے تھے اور اس کا اظہار کر کے وہ سیاسی مسایل میں پیچیدگی پیدا کرنا پسند نہ کرتے تھے، لیکن اب کہ ان دونوں کی سیاسی راہیں بالکل علحدہ قایم ہو چکی ہیں اور ان کے باہم ملکر کام کرنے کا سوال باقی نہیں رہا، کوئی وجہ نہ تھی کہ گاندھی جی کے دل کا کانٹا زبان پر نہ آتا۔ میں اسے کانٹا اس لئے کہتا ہوں کہ گاندھی جی ایسی شخصیت کے لئے اس سے زیادہ سخت لفظ استعمال کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، ورنہ ذہنیت کی اس پستی و ذلت کا اظہار اور وہ بھی ایک ایسی [illegible] کی طرف سے ہر ممکن لعنت و ملامت کا مستحق ہے —— بہرحال اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اصل نزاع زبان کی نہیں ہے، رسم خط ہی کی ہے یعنی ہندوؤں کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ زبان کو عام فہم بنایا جائے کیونکہ وہ خود اس کے لئے طیار نہیں ہیں اور اسکے بالکل برعکس اُسے اور زیادہ مشکل بناتے جا رہے ہیں بلکہ اصل مدعا یہ ہے کہ وہ رسم خط اُن کی نگاہ کے سامنے نہ آنے پائے جس میں قرآن لکھا جاتا ہے اور جو کسی وقت مسلم بادشاہوں نے رائج کیا تھا —— پھر اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے اردو سے عربی فارسی کے الفاظ بالکل نکال بھی دئے (جس کا کوئی امکان نہیں ہے) تو کیا وہ ہندوؤں کو اس کی طرف مایل کر سکیں گے اور کیا انکی یہ ذہنیت بدلی جا سکتی ہے کہ قرآنی حروف کا مطالعہ ان کے دھرم کو بھرشٹ کر دینے والا ہے

[1] ملاحظہ ہو اس ماہ کے نگار میں مولوی عبدالحق صاحب کا مقالہ صفحہ ۹

یقیناً اب راستہ بالکل صاف ہوگیا ہے اور ہم کو پھر از سر نو اس مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ اُردو زبان کی بقا و اصلاح کے لئے ہم کو کیا طریقِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں نگار کے مطالعہ کرنے والوں کو میں میاں بشیر احمد صاحب بی۔اے اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے کے ان مقالات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جن میں سے ایک جون کے رسالہ میں شایع ہوا ہے اور دوسرا اسی اشاعت میں۔ مجھے جس حد تک اتفاق یا اختلاف ہے اُسے یہاں ظاہر کئے دیتا ہوں۔

۱۔ کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ اُردو کی بجائے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا جا رہا ہے اور مہاتما گاندھی اس میں ایک اور لفظ کا اضافہ کرکے ہندی ہندوستانی کہنا پسند کرتے ہیں۔ میں اسکے بالکل خلاف ہوں۔ مانا کہ کسی وقت اس زبان کا نام ہندوستانی تھا، لیکن اب کہ ہر شخص اُردو کے نام سے واقف ہو چکا ہے اور یہ لفظ سُنکر ایک خاص زبان و انشا کی طرف ذہن بہ آسانی منتقل ہو جاتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بدلا جائے ایک طرف تو یہ آسانی پیدا کرنے کا خیال ہے کہ جو الفاظ دوسری زبانوں کے بکثرت استعمال ہونے لگے ہیں انہیں کو جیوں کا تیوں لے لیا جائے اور دوسری طرف اصلاح کی یہ دقتہ پسندی کہ لفظ اُردو ہی کو اُڑا دیا جائے جسکے مسمّی کو ہندوستان کا ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے اور ایک زمانہ سے سمجھتا چلا آرہا ہے۔

یہ تحریک نتیجہ تھی صرف اس خیال کا کہ اُردو سے ہندوؤں کو جو تنفر پیدا ہو چلا ہے ممکن ہے وہ اس طرح دور ہو جائے اور ایک عام مشترک زبان پیدا کرنیکی جو آواز ہندوؤں کی طرف سے بلند ہوئی تھی اُسے وہ بے اثر سمجھکر اُردو سے بالکل اپنی بے تعلقی کا اظہار نہ کر بیٹھیں۔ حالانکہ (جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں) ہندوؤں کا مقصد صرف اُردو رسم خط کے خلاف جہاد کرنا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ پہلے اس لفظ کو مٹایا جائے جو ایک مخصوص زبان کے مخصوص رسم خط پر دلالت کرتا ہے اور اس کے بعد رسم خط کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔

پھر اب کہ ہندو عصبیت کی ایک منزل اور طے کرکے لفظ ہندوستانی بھی ہندی میں تبدیل کرنے پر مُصر ہے، اس باب میں مسلمانوں کی رواداری و مسالمت کوئی معنی نہیں رکھتی اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اُردو کو ہندوستانی یا کسی اور نام سے موسوم کریں۔ کیونکہ اگر اب ہم اُردو کا نام سنسکرت رکھ لیں تو بھی ہندو اس کا دیکھنا یا پڑھنا گوارا نہ کریں گے اگر اس کا رسم خط وہی ہے جو "قرآنی حروف" کا ہے۔

۲۔ دوسری تحریک یہ کی گئی کہ اُردو کو زیادہ سلیس و آسان بنایا جائے تاکہ ہر شخص اسے سمجھ سکے

اس تجویز کی پسندیدگی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس سلسلہ میں جو سب سے زیادہ مضرت رساں اور ناعاقبت اندیشانہ قدم اُٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ اُردو سے عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کے ترک کرنے پر زور دیا گیا۔ یہ سمجھنا کہ عربی و فارسی الفاظ کے نکالدینے سے اُردو آسان و سلیس ہو جائے گی، خیال خام ہے۔ کیونکہ اُردو

زبان میں سوائے مصادر اور حروف صلہ و روابط کے جتنا حصہ الفاظ کا موجود ہے ان میں سے اکثر عربی و فارسی ہیں اور اگر آج ہم انکو علٰحدہ کر دیں تو کسی طرح اپنے مفہوم کے اظہار پر قادر نہیں ہو سکتے سوائے اس صورت کے کہ ہم سنسکرت، انگریزی یا کسی اور زبان سے الفاظ کا استعارہ کریں۔ میں اس حد تک بالکل متفق ہوں کہ ادائے مفہوم کے لئے جب تک ہمیں سادہ و آسان الفاظ عام بول چال کے مل سکتے ہیں، عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اسکی پابندی ہم روز کی گفتگو اور قصے کہانیوں میں تو کر سکتے ہیں، مگر جسوقت سوال علمی مضامین یا دقیق مطالب کا آئیگا اسوقت ہمارے لئے چارہ کار سوائے اس کے کچھ نہ ہوگا کہ غیر زبانوں سے مدد لیں، اور جب ہم کو غیر زبانوں ہی سے مدد لینا ہے تو کیوں نہ عربی فارسی سے مدد لیں جس سے مسلمانوں کو بہت دیرینہ تعلق حاصل ہے۔ ایک "زبان" ہمیشہ اسی وقت مکمل کہی جا سکتی ہے جب وہ دقیق سے دقیق خیالات کو جامعیت کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہو۔ زبان نام صرف "ہوا گرم ہے اور روٹی نرم ہے" کا نہیں ہے بلکہ وہ ذریعہ ہے ان جذبات و کیفیات کے اظہار کا جو ارتقاءِ ذہن کے انتہائی نازک و لطیف احساس سے پیدا ہوتے ہیں اور ان نتائج کے پیش کرنے کا جو علوم و فنون کے تمام مدارج تکمیل سے تعلق رکھتے ہیں اور اسکے لئے عربی فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال ناگزیر ہے۔ دوسری خصوصیت ایک مکمل زبان کی یہ بھی ہے کہ وہ طویل سے طویل مطالب کو بہت مختصر الفاظ میں ادا کر سکے — میاں بشیر احمد بی۔ اے اپنے مضمون میں (صفحہ ۱۸ - نگار ماہ جون ۱۹۳۶ء) میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:-

"عربی اور فارسی کی غیر ضروری ترکیبیں ترک کر دینی چاہئیں اور اگر ادائے مفہوم کیلئے فقرہ ذرا لمبا ہو جائے تو کیا حرج ہے"

حرج تو کوئی نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس لمبے فقرے سے وہ مفہوم بھی ادا ہو سکتا ہے یا نہیں جو عربی فارسی کے ایک مختصر لفظ سے پورا ہو جاتا ہے۔ یقیناً بعض جگہ معمولی خیالات کے اظہار میں ہم ایک سادہ لمبے فقرے سے کام لے سکتے ہیں، لیکن بلند خیالات کے اظہار میں اکثر جگہ عربی فارسی ترکیبوں کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پھر جبکہ عربی و فارسی سے بیگانہ ہو کر ہم نہ اپنی زبان میں انشاءِ عالیہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ علوم و فنون اس میں منتقل کر سکتے ہیں تو پھر گھریلو اور بازاری زبان کی حمایت میں ایسا درس دینا جو لوگوں کو عربی و فارسی سے بیگانہ بنا دینے والا ہے ایک نادان کی دوستی سے کم خطرناک نہیں۔

زبان نام نہ بیوی سے باتیں کرنے کا ہے اور نہ ہوٹلوں میں جا کر بیرا خانساماں سے توس مکھن مانگنے کا۔ اسی طرح نہ اسکا مقصود صرف چڑے چڑیا کی کہانی بیان کرنا ہے نہ چار درویش کا قصہ لکھنا۔ زبان ہمیشہ خیالات و جذبات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ انسان سوچے آسمان کی اور کہے زمین کی۔ خیال جتنا نازک و بلند ہوگا زبان میں بھی اتنی ہی نزاکت و بلندی کا پیدا ہونا ضرور ہے۔ پھر اسی کے ساتھ موقعہ و محل کو بھی دیکھئے کہ وہی ایک لفظ ہے جو کسی جگہ خوشنما معلوم ہوتا ہے اور کسی جگہ بدنما اس لئے یہ فیصلہ کر دینا کہ دو مترادف الفاظ میں سے (جن میں سے ایک آسان ہے اور دوسرا دقیق) ہمیشہ سہل لفظ کا استعمال موزوں ہوگا درست نہیں ہو سکتا۔ بہرحال عربی و فارسی الفاظ کے ترک کر دینے کی تجویز سے مجھے سخت اختلاف ہے کیونکہ اول تو اس کا امکان ہی نہیں ہے اور وہ لوگ بھی جو اس تحریک کے محرک ہیں خود سیکڑوں الفاظ عربی و فارسی کے

اپنی تحریر و تقریر میں استعمال کرنے پر مجبور ہیں[1] اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ انتہائی جد و جہد کے بعد یہ ممکن ہو تو زبان کو اس سے سخت نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے کیونکہ ہزاروں الفاظ اُردو میں عربی فارسی کے ایسے رائج ہیں جن کا بدل کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اُردو زبان اور زبان کے ساتھ ہی مسلمانوں کے تعلقات عربی و فارسی الفاظ سے اتنے دیرینہ ایسے گہرے ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دینا گویا "اسلامی کلچر" کی خصوصیات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔ انسانی تمدن و تہذیب میں سب سے زیادہ اہم چیز صرف زبان ہے جو ایک قوم کے کلچر سے بنتی ہے اور اس کے کلچر کو بناتی ہے یعنی تمدن و زبان دونو باہم کر اس طرح وابستہ ہیں کہ آپ ایک کو دوسرے سے علٰحدہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس کوشش کا نتیجہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا اور نہ یہ معلوم کر سکا کہ بصورت کامیابی جو اثر اس کا مسلمانوں کی مخصوص تہذیب پر پڑے گا وہ کیونکر گوارا ہوگا۔

میں اس حد تک بالکل موافق ہوں کہ اگر حُسنِ انشاء کو تباہ کئے بغیر کوئی مفہوم خالص دیسی الفاظ سے ادا ہو سکتا ہے تو ضرور اس کا لحاظ رکھا جائے لیکن عربی و فارسی کا علم میں ہر مسلمان کے لئے ضروری جانتا ہوں کیونکہ اس کے بغیر ادب عالیہ و علوم و فنون کی پیداوار ممکن نہیں ہے۔ رنگینی مولانا سلیم مرحوم اور ہمارے عزیز دوست پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی یہ تجویز کہ زبان کو وسیع بنانے کے لئے جدید الفاظ کا وضع کرنا اور دوسری زبانوں کے رائج الفاظ کو بجنسہ لے لینا ضروری ہے سو میں کیا ہر ہر بہی خواہ اُردو زبان کا اس کی موافقت کریگا، لیکن میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ علوم و فنون کی اصطلاحیں بغیر عربی و فارسی کی مدد کے طیار ہو سکتی ہیں۔ میاں بشیر احمد صاحب اور مولوی عبد الحق صاحب نے اصلاح و ترقی زبان کے متعلق بعض عملی تدابیر بھی بتائی ہیں جو قارئین نگار پڑھ چکے ہوں گے۔ ان کے متعلق کوئی بسیط گفتگو کرنا تحصیل حاصل سمجھتا ہوں کیونکہ اول تو ان تدابیر کی صحت سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا دوسرے اسلئے کہ میں جانتا ہوں مسلمان کبھی اس طرف متوجہ نہ ہوں گے اور قیامت تک وہ مرکزیت کے اصول پر کام کرنے کے لئے طیار نہ ہوں گے۔ جیسا کہ میں تمہید میں عرض کر چکا ہوں، مسلمان اس دور سے گزر رہے ہیں جب ایک قوم اپنے ماضی کو یاد کر کر کے صرف روتے رہنا ہی پسند کرتی ہے اور مستقبل کی طرف قدم بڑھانے کی ہمت اپنے میں نہیں پاتی۔ اور اسکا سب سے بڑا ثبوت اسی زبان کے مسئلہ میں یہ ہے کہ مسلمانوں کی زبان سے جب کوئی بات اس سلسلہ میں نکلتی ہے تو اس کی ابتدا ہندوؤں کی شکایت سے ہوتی ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اسوقت تک اُردو نے جو ترقی کی وہ ہندوؤں کی بدولت تھی اور آیندہ بھی انھیں کی مدد سے بیڑا پار ہو سکتا ہے۔

جس قوم کی ذہنیت اس حد تک پست ہو جائے اور جسکی تنگ مائگی کا یہ عالم ہو کہ گاندھی جی کے بیٹے کے مسلمان ہو جانے پر پھولی نہ سمائے، اسکی طرف سے کم از کم میں تو کوئی توقع قائم کر نہیں سکتا۔ ممکن ہے میاں بشیر احمد صاحب یا دوسرے حضرات کے سامنے کوئی صورت کامیابی کی ہو۔ اس سے قبل لاکھوں قومیں دنیا میں آئیں اور تباہ ہوئیں، پھر اگر مسلمان کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے، علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ وہ دنیا کو خود ہی قید خانہ قرار دیتا ہے اور آخرت میں اپنی ہر دنیاوی ناکامی پر سو سو حوریں حاصل کرنے کا دعویدار بنا بیٹھا ہے

---

[1] چنانچہ خود میاں بشیر احمد صاحب نے اپنے مقالہ میں سیکڑوں الفاظ عربی و فارسی کے ایسے لکھے ہیں جن کو وہ اگر چاہتے تو "فقرہ کو لمبا" کر کے نکال سکتے تھے، لیکن ان کا ذوقِ سلیم اس کو گوارا نہ کر سکا۔

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت

بہت سے اصحاب اس جملے کے معنے نہیں سمجھیں گے اور اس عنوان کو پڑھ کر انھیں اُلجھن ہوگی۔ اسلئے سب سے اول یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنے ہیں "ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن"۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۴ اور ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انھیں تاریخوں میں "ہندو ساہتیہ سمیلن" کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے اس سے قبل کہ میں پرشد کے اس اجلاس کے حالات بیان کروں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی "شان نزول" سے مختصر طور پر بحث کروں یعنی یہ کہ یہ انجمن کن وجوہ سے وجود میں آئی اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ جب تک یہ نہ کیا جائے گا اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔

مسٹر کاکا کالیلکر اس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنے ایڈریس میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے میں اسی کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں کیونکہ ان کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹ ساہتیا سمیلن منعقدہ بڑودہ میں سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کولھاپور کے اجلاس میں مہاراجہ بڑودہ نے بھارت ساہتیا پرشد کا خاکہ بہت پرزور طریقے پر پیش کیا۔ پھر کراچی میں کانگریس کے موقع پر مسٹر کنہیالال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیا سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا اور ہم ایک جا جمع ہوئے تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی، اسے عمل میں لانے کیلئے مسٹر کنہیالال منشی، ہری ہر شرما اور گرو دھا شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیا سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹ ساہتیا سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کولھاپور کے تخیل کو عمل میں لانے کے لئے ہندی ساہتیا سمیلن سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ہندی ساہتیا سمیلن نے کاکا کالیلکر، ہری بھاؤ اپادھیائے اور بابا راگھوداس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹ ساہتیا سمیلن نے اپنی ساہتیا پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ ساہتیا پرشد کے لئے ایک مہاراشٹ کمیٹی قایم کی جائے جو ہندی ساہتیا سمیلن کو بھارتیہ ساہتیا سمیلن قایم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح

کرناٹک اور گجرات کی ساہتیا سمیلنوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

یہ تو ہے اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد سو وہ اس قرارداد سے ظاہر ہے جو ناگپور کے اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"اس پرشد کا اُودیش (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبوں) اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرنا اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا۔

(ب) اس سبھا کا کام "ہندی یعنی ہندستانی" میں ہوگا۔۔۔۔۔۔"

اُس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لئے مقرر کی گئی تھی، پہلا کام یہ کیا کہ ماہنامہ "ہنس" کو جو کئی سال سے لک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی اڈیٹری میں جاری تھا، اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اب اسے پرشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مورخ مسٹر کنہیالال منشی بھی اس کی اڈیٹری میں شریک ہو گئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد جو بھارتیہ ساہتیا پرشد کی پیدائش اور مقاصد کے متعلق تھی، میں آپ کو اس کے پہلے اجلاس کی روداد سنانا چاہتا ہوں جو ہم سب کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۲۴ راپریل ۱۹۳۶ء کو تقریباً ۱۲ بجے دن کے اس کا پہلا جلسہ شروع ہوا۔ سب سے اول مسٹر کاکا کالیلکر نے اپنا اڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ اڈریس جو صرف ایک صفحہ کا تھا تقسیم کر دیا گیا اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ مطبوعہ اڈریس پڑھ کر سنانا فضول ہے وہ آپ خود پڑھ لیں گے، زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سُن سکے۔

پرشد کے اس جلسہ کا سب سے بڑا کارنامہ وہ رزولیوشن تھا جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اسی پر رہی۔ اس کے پہلے جزسے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جز پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اصل مسودے میں یہ الفاظ تھے کہ اس پرشد (انجمن) کی ساری کارروائی "ہندی ہندوستانی" میں ہوگی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے رزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق جو تحریر شایع کی اُس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندوستانی ہوگی جس کا کیا معنی فرمانے لگے کہ کانگریس کا رزولیوشن بھی میں نے ہی بنایا تھا۔ میں نے عرض کیا یہ صحیح ہے لیکن اُس وقت ہندوستانی کے معنے ہم ہرگز ہندی نہیں سمجھے تھے۔ کہنے لگے کہ اب میں نے اس کے معنے بتا دئے ہیں جو ہنس کی تحریر میں آپ نے دیکھے۔ یہ گاندھی جی کی محض زبردستی ہے۔ یہ انھوں نے

ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے یعنی "ہندی ہندوستانی" جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پرشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیلکر صاحب نے اپنے اڈریس میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کرلیا تھا کہ ہندوستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے تاکہ اس کی گنجایش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا مفہوم "اردو" لے سکے۔ جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ "ہندی ہندوستانی" سے آپ کا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ ہندی جو آگے چلکر ہندوستانی ہونے والی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی یہ تو آپ کی خواہش یا منتہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ہندی کونسی زبان ہے اور ہندوستانی کونسی، مہاتما جی نے فرمایا کہ ہندی ادبی زبان ہے اور عام لوگ کم سمجھتے ہیں اور ہندوستانی وہ زبان ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا۔ اپنے مطبوعہ اڈریس میں اُنھوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو ہندوستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس بھاشا میں اُن فارسی الفاظ کو جو زبان میں رائج ہو گئے ہیں ترک نہ کیا جائے۔ غرض صبح کا جلسہ اسی پر ختم ہو گیا اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔

سہ پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ رزولیشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رکھئے یا ہندوستانی کا، ہندی ہندوستانی کے کوئی معنے نہیں۔ تو فرمایا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا، مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اسلئے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے، اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے اور خیال تھا کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس کے ضرور میری تائید کریں گے، لیکن مجھے افسوس اور کسی قدر مایوسی ہوئی کہ انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے۔ اور ایک نہیں وہاں اکٹھے تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے۔ اس کے بعد جب یہ گفتگو بڑھی تو گاندھی جی نے "ہندی ہندوستانی" کو بدل کر "ہندی یعنی ہندوستانی" کے الفاظ رکھدئے۔ اس پر اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ رزولیشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندوستانی۔ کیونکہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں، اس بنا پر ہندی اور ہندوستانی ایک زبان نہیں ہو سکتیں اور اس لئے ہندی یعنی ہندوستانی بے معنی ہوگا اور دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھئے اور میں اس کی تائید کروں گا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کنہیا لال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہئے۔ مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا

کوئی چارہ نہیں، فیصلے کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ووٹ کا حکم صادر ہوا۔ لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمیلن کے ان نمائندوں کو بھی ووٹ کا حق دیدیا گیا جو اسوقت اس جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت رائے اس ترمیم کے خلاف نکلی۔ اگر ہندی سمیلن کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دیجاتی جس کا انھیں حق حاصل نہ تھا تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی۔ مگر مہاتما گاندھی بھارتیہ ساہتیہ پرشد کو ہندی سمیلن کا بچہ سمجھتے ہیں اور ان کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ہونے پاتیں، حالانکہ بقول منشی پریم چند کے یہ خیال صحیح نہیں ہے پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہو گئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہو چکا تھا دوسرے دن ۲۵ اپریل کو ایک معمولی جلسہ ہوا۔ پہلے دن سہ پہر کو ایک گفتگو بھی چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رُخ بدلنا چاہئے۔ بار بار پرانے فرسودہ خیالی مضامین کو دھرانا موجودہ حالات کے بالکل منافی ہے۔ ہمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہئے۔ اس بحث میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی حصہ لیا اور یہ ارادہ ہوا کہ دوسرے روز ایک رزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کنہیا لال منشی اور دو ایک اور صاحب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے۔ پرشد کے مہا پرشوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی سخت رزولیوشن پیش نہ کردیں، رات ہی کو اس مضمون کا ایک ہلکا سا رزولیوشن تیار کیا اور دوسرے روز اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے اسے پڑھ کر سنایا جو بلا اختلاف منظور کر لیا گیا۔ لیکن یہ ریزولیوشن بہت کچھ تصریح کا محتاج تھا اس لئے ان صاحبوں نے جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر مصر تھے، ایک الگ بیان شایع کیا۔ اس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا۔ اس میں سے چند تو ہندی ساہتیہ سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمائندے انتخاب کئے اور کچھ مہاراشٹ ساہتیہ سمیلن نے اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندوستانی کو ہندی میں اور ہندی کے معنے ہندوستانی بنانے میں، پھر "ہندی ہندوستانی" کی جدید لفظ کے اختراع میں اور آخر میں ہندی یعنی ہندوستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں۔ پہلے اُردو کا لفظ ترک کرکے ہندوستانی اختیار کیا گیا تھا یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس پر ہم بھی رضامند تھے اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کر دیا تھا بلکہ ان کا اصرار تھا کہ اُردو کی بجائے اب ہندوستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔ فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کر لیا تھا۔ اب ہندوستانی کا لفظ بھی متروکات میں داخل ہو گیا اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کے لئے ان کے پاس جواب موجود ہے، وہی جو گاندھی جی نے فرمایا "ہندی یعنی ہندوستانی"، گاندھی جی نے رسالہ ہنس کی زبان کو بھی ہندی اتھوا ہندوستانی فرمایا ہے۔ جب ان سے کہا گیا

کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ "وشال بھارت" سے بھی زیادہ مشکل ہے تو انھیں حیرت ہوئی۔ ہنس کے اڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے، کہ "اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں۔" اس کی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبۂ صدارت سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ہندی ساہتیا سمیلن میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے اور اس کا پہلا اجلاس اس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ایک فایدہ یہ ہوگا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں امید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی۔" کاکا کالیلکر صاحب نے بھی اپنے اڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ ساہتیہ پرشد) کی ابتدا کی ہے انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ چار اسار کا رو یا۔ راشٹر بھاشا (قومی زبان) ہندی ہندوستانی میں چلے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی ابھی ایک ہی ہو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہو جائے تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام ناگری میں کریں"۔

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کے لئے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا یہ مقصد بے شک قابل تعریف ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہے، لیکن اس کا دوسرا مقصد بلاشبہ ہندی زبان کا پرچار ہے جس میں وہ اور ہندی سمیلن دونوں متفق ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پرشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر انھیں ایام اور اسی مقام میں رکھا گیا جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سمیلن کا اجلاس تجویز ہوا تھا تاکہ ہندی سمیلن کے اثر اور امداد سے مستفید ہو سکے۔ غرض یہ کہ پرشد ادبیات کے مسئلے سے گزر کر زبان کی اشاعت پر آگئی ہے اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحاد عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بد دل ہی نہیں تھے بلکہ برہم بھی ہوئے۔ اُن کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اُردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے۔ لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ۔

اسی گفتگو میں بنگال، مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کے نمایندوں نے یہ کہا اور غالباً اُن کا یہ کہنا ایک حد تک درست ہے) کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا قائم رکھنا یا داخل کرنا ضروری ہے کیونکہ اُن سنسکرت لفظوں کا

سمجھنا ہمارے لئے زیادہ آسان ہے بہ نسبت اُن ہندی اور فارسی لفظوں کے جو آپ کی سہل ہندی میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے کہ ہماری زبانوں میں پہلے ہی سے سنسکرت الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ ان زبانوں کی بنیاد زیادہ تر سنسکرت پر ہے۔ اس خیال کی تائید کاکا کالیلکر کے ایڈریس سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں اہل دکن کی طرف سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو آپ کی (یعنے شمالی ہند کی) ہندی سمجھنے میں مشکل پڑتی ہے۔ پنڈت جواہر لال کی ہندی آپ کے لئے عام فہم ہوگی مگر ہمارے لئے کٹھن ہے..... " وہ ہندی بھی جو دلی لکھنؤ کے بازاروں میں گنوار لوگ سمجھ سکتے ہیں وہ نیچرل ہندی ہے لیکن اُسے بھی ہم بہت ہی کم سمجھتے ہیں..... کانگریس میں جو ہندی بولی جاتی ہے اس میں فارسی شبدوں کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ دیہات سے آنے والے نمائندوں کے لئے انگریزی اور ہندی دونوں بھاشائیں یکساں مشکل ہو جاتی ہیں":-

اسی دوران میں لغت کی بحث نکلی یعنے ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں عام فہم الفاظ کے علاوہ وہ تمام الفاظ جمع کئے جائیں جو ہندی بنگالی گجراتی مرہٹی وغیرہ میں مشترک ہیں اور ان تمام الفاظ کی تعداد دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ ہو۔ اس میں دو مشکلیں ہیں ایک تو یہ کہ ہندی اور خاصکر فارسی الفاظ کی صورتیں مختلف زبانوں میں بگڑ بگڑا کر ایسی ہوگئی ہیں کہ ایک لفظ ہوتے پر بھی اُن کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظ تو ایک ہی ہے لیکن مرہٹی میں اس کے معنے کچھ ہیں اور ہندی یا بنگالی میں کچھ اور۔ علاوہ اس کے ایسی ڈکشنری اُن مبتدیوں کے لئے تو کسی قدر کارآمد ہو سکتی ہے جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں لیکن ادب کی ضروریات کے لئے بالکل کارآمد نہیں ہو سکتی۔ میں نے ۱۹۳۳ء میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس میں جس کا اجلاس بڑودہ میں ہوا تھا، یہ تجویز پیش کی تھی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا کہ تمام ہندی ادب اور زبان کو پڑھ کر اردو فارسی عربی الفاظ اور محاورے چن لئے جائیں اور اسی طرح اردو ادب اور زبان کا مطالعہ کرکے تمام ہندی الفاظ اور محاورے نکال لئے جائیں اور اُن سب کو ایک جگہ جمع کرکے کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ ہماری زبان کا مشترک سرمایہ کیا ہے۔ اس کے بعد جن الفاظ کے اضافے کی ضرورت ہو یا جو اصطلاحات بنانی مقصود ہوں تو وہ ایک ایسی کمیٹی کے مشورے سے ہو جس میں دونوں زبانوں کے نمائندے ہوں۔ لیکن موجودہ حالات دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام کوششیں بے سود ہیں۔

میں ایک بات کہنی بھول گیا وہ یہ کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما جی کے نام وصول ہوا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کیگئی ہے کہ وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں جس نے ملک کی زبان "ہندوستانی" قرار دی ہے انھوں نے مہاتما جی کی اندور والی تقریر نیز "ہنس" والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن میں ہندی یا ہندوستانی

کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ہندی کے معنے ہندوستانی قرار دیے ہیں جو درست نہیں۔ اُردو یا ہندوستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے قایم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے ان کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان کے بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دیں گے لیکن ہنس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہے۔ مجیب صاحب ساہتیہ پرشد کے ساتھ "بھارت" کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس لفظ کا مفہوم آریائی ہندوستان ہوتا ہے اور اس لئے اس سے نہ صرف مسلمان اور اُن کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی بنانے میں صرف ہوئیں بلکہ صدہا سال کے تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کئے ہیں وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ اُن کی رائے میں بھارت کی بجائے ہندوستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔ مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے لیکن ہماری عام اور مشترکہ زبان کو ان میں سے کسی پر بھی منحصر نہیں کرنا چاہیئے۔ عربی اگر غیر زبان ہے تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی تھی۔ جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے۔ تلفظ کی سہولت نے اُن کی صورتوں کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے مثلاً گرام کا گانو ہو گیا، ورش کا برس بن گیا۔ اب پھر اصل سنسکرت الفاظ کی طرف رجوع کرنا اور مروجہ الفاظ کو ترک کرنا یا تو اظہار مشیخت ہے یا جہل یا تعصب پر مبنی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات اُس زندہ زبان کی اشاعت سے کچھ سروکار نہیں رکھتے جو عام طور پر بولی جاتی ہے بلکہ انھیں ہندی زندگی کو آریائی بنانے کی فکر ہے۔ مجیب صاحب نے اُس خط کا بھی ذکر کیا ہے جو مسٹر کنہیا لال منشی نے عاقل صاحب (جامعہ ملیہ) کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ اس میں مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں، مرہٹوں، بنگالیوں اور کرناٹیوں نے جن روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ہے اُن میں اُردو کا عنصر تقریباً معدوم ہے۔ مجیب صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اور " میں ہرگز اس امر کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ انھیں آپس میں ایک دوسرے سے نیز مسلمانوں سے قریب آنے کے لئے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے صرف خالص اُردو عنصر سے ہمیں بحث نہیں بلکہ ہماری بحث شمالی ہند کی زندہ زبان اور محاورات سے ہے۔ اگر یہ زندہ زبان مشترکہ زبان کی بنیاد قرار دی جائے تو مسلمان پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہیں۔ لیکن سنسکرت کی طرف رجعت کرنے کے یہ معنے ہیں کہ وہ (مسلمان) اور اُنکی تمام خدمات جو انھوں نے ہندی، بنگالی اور گجراتی کے حق میں کی ہیں، ناقابل لحاظ ہیں۔ ان حالات میں ہم سے شرکت کی درخواست کرنا گویا ہماری ہلاکت میں خود ہماری شرکت کی استدعا کرنا ہے "

اس کے بعد انھوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی اس تقریر کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے الہ آباد میں ہندی میوزیم کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی اور جس میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ چینی زبان کے بعد ہندی زبان ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اسکے معنے یہ ہوئے کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہو گیا۔ یعنے وہ زبان ہندی ہو گی۔ کیونکہ ہندوستان میں اسی زبان کے بولنے والے سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ لہذا ہندوستانی کے حامی کسی گنتی میں نہیں۔ یہ "فرقہ وارانہ تصفیہ" کی طرح ایک نئے فساد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔

خط کے آخر میں پروفیسر مجیب نے چند امور خاص طور پر مہاتما جی کے غور کے لئے پیش کئے ہیں اور اُن سے التجا کی ہے کہ اگر وہ مناسب خیال فرمائیں تو وہ عام اعلان کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں وہ اُمور یہ ہیں:-

۱- ہماری مشترکہ زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہوگی نہ کہ ہندی کے نام سے۔

۲- ہندوستانی کو کسی فرقے کے مذہبی روایات سے متعلق کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۳- لفظ کا معیار اس کا رواج ہوگا نہ کہ اس کا دیسی یا بدیسی ہونا۔

۴- تمام وہ الفاظ جو اُردو کے ہندو اہل قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کئے ہیں مروجہ الفاظ تسلیم کئے جائیں۔

۵- اصطلاحی الفاظ خاصکر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ اُردو، ہندی اور سنسکرت کی اصطلاحات سے فطری انتخاب کی بھی گنجایش رکھی جائے۔

۶- دیوناگری اور عربی رسم خط دونوں مسلم خیال کئے جائیں اور ان تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندوستانی کے حامیوں کے ہاتھ میں ہو، دونوں خطوں کے سکھانے کی سہولت بہم پہونچائی جائے۔

میں نے خط کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ پورا خط پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور خط داخل دفتر ہو گیا۔ البتہ پنڈت جواہر لال صاحب نے یہ فرمایا کہ تعجب ہے کہ مجیب صاحب جیسے تعلیم یافتہ شخص کو ٹنڈن صاحب کے بیان پر اعتراض ہے، ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ ان کا کیا مطلب تھا یہ سمجھ میں نہ آیا۔ جس خلوص اور اُمید اور لجاجت کے ساتھ یہ خط مہاتما جی کی خدمت میں لکھا گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ مہاتما جی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر فرماتے اور جو بدگمانی اُن کے اور ان کے رفقا کے رویہ سے پیدا ہو گئی ہے اسے رفع کرتے۔ لیکن افسوس انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ ان حضرات نے ہندی کے پرچار اور اسے قومی زبان بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

اجلاس کے دوران میں جبکہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سنکر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف

میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سرتاسر غلط، بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہرچند یہ توجیہ کرکے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے لیکن دل نہیں مانتا۔

مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اُردو یا ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے تھے۔ میں نے ایک آدھ بار ٹوکا کہ یہ ہندو مسلم سوال نہیں ہے بلکہ بحث ہندی اُردو یا ہندوستانی کی ہے۔ ہزارہا ہندو ایسے ہیں جن کی زبان اُردو ہے وہ اُردو کے ادیب ہیں، اسی طرح ہزاروں مسلمان ہیں جو ہندی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس لئے اس بحث کو فرقہ واری رنگ نہیں دینا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال انحطاط پذیر ہو رہا ہے۔ اسی ضمن میں میں نے گاندھی جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اُردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں۔ یہ سن کر گاندھی جی اور دوسرے صاحبوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں نے اس پر خوب غور کیا ہے اور میں اپنے اس دعوے کو ثابت کرسکتا ہوں۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہوا! میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو زبان کی بنیاد عوام کی زبان پر ہے جو اُسوقت بولی جاتی تھی اور اس لئے اس میں وہ تمام ہندی لفظ اور محاورے آگئے جو عام لوگوں کی زبان پر تھے۔ ہندی زبان کتابی ہے۔ عوام کی بولی سے اسے بہت کم سابقہ رہا ہے، اسے جب کسی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو سنسکرت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اُردو ہندی کی نسبت زیادہ ہندی ہے۔

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی یعنے اُردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے حکیم اجمل خاں کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آگیا ہے کہ اُردو تو اُردو وہ تنہا ہندوستانی کا لفظ بھی سننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں جو برسر اجلاس تھی، ایک بار نہیں کئی بار فرمایا کہ اگر رزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اُردو سمجھا جائے گا۔ لیکن اُن کو نیشنل کانگریس کے رزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اس قلب ماہیت *Change of heart* کی کیا وجہ ہے؟ کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے ہیں جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے؟ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر جدل، توڑ جوڑ اور داؤں پیچ کا باعث ہمارے ملک کا بدنصیب پالیٹکس ہے۔ جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتا ہو جائے گا اُس وقت تک وہ ہندوستانی ہندوستانی پکارتے رہے جو ٹھیک کر

سلانے کے لئے اچھی خاصی توری تھی۔ لیکن جب انھیں اس کی توقع نہ رہی یا انھوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی تو ریاکی چادر اُتار پھینکی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں۔ وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اُردو نہیں چھوڑ سکتے ان کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسایل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لئے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اس کی اشاعت و ترقی کے لئے کمر بستہ ہو جائیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اس کے متعلق ہم ایک مفصل تجویز عنقریب پیش کرنے والے ہیں۔

عبدالحق
آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی جلدیں ہیں جن کے ۰۰۰ا صفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے ان میں تقریباً ۰۰ا مسایل پر آپ کو وہ مواد ملیگا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا، چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:-

مسئلۂ جبر و اختیار - خواب کی حقیقت - معاد و خلود - طبقۂ نسواں اور رغزلگوئی - برج بابل - فاسست جماعت - سامری کون تھا - باغ ارم کی حقیقت - فلسفۂ محبت - بھوت پریت - اصحاب کہف - سالویشن آرمی - پال کا سبب معجزہ و کرامات - فرقۂ معتزلہ - مذہب و عقل - طوفان نوح - یاجوج ماجوج - برہمو سماج - طبقۂ نسواں اور تعلیم - مریخ کی حقیقت - منصور حلاج - چند الفاظ کی تحقیق - اصطلاحات تصوف کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ

قیمت ہر دو جلد معہ محصول خریداران نگار سے للعہ - غیر خریداران سے ۲ے - منیجر نگار - لکھنؤ

تذکرۂ معرکۂ سخن

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا صرف پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اُردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں، فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے - قیمت معہ محصول ۱۲/ - منیجر نگار - لکھنؤ

تاریخ مذہب کا ایک خونیں ورق

شارلکان یا کارلوس پنجم، ہسپانیہ کا بادشاہ اپنی مملکت کی غیر معمولی وسعت پر بہت نازاں تھا اور اس کا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ "میری سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا"۔ لیکن اسے اپنی زندگی میں، جو غیر معمولی کارناموں سے پُر نظر آتی تھی، بہت زیادہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ اپنی ساری عمر میں، ایک رات بھی آرام سے نہ سو سکا، اس کی زندگی کروٹ ہی بدلتے بدلتے ختم ہوگئی، وہ اپنے وسیع ملک کی حفاظت کرتے کرتے اُکتا گیا۔ یہاں تک کہ آخرکار فرمانروائی اس کے لئے وبال جان ہوگئی اور وہ نہایت خوشی کے ساتھ حکومت سے دست بردار ہوگیا۔ وہ اب سکون اور اطمینان کا طالب تھا اور یہ جنس بازار سلطنت میں بالکل عنقا ہے، چنانچہ جسوقت اُس نے حکومت سے دستبرداری اختیار کی تو گرجاؤں میں اس کے لئے دعائیں مانگی گئیں کہ خدا اس کے گناہوں کو معاف کرے — یہ ۱۵۵۵ء کا واقعہ ہے۔

شارلکان نے بڑے بڑے معرکوں میں شرکت کی تھی، بارہا خود دست بدست دشمنوں سے لڑا تھا۔ وہ فرنسوا اول شاہ فرانس، سلطان سلیمان قانونی فرمانروائے حکومت عثمانی اور ان کے علاوہ دوسرے بادشاہوں سے بھی بَبر آزما ہوا تھا اور اس نے ان تمام جنگوں میں اپنے کو نہایت شجاع اور غیر معمولی بردبار، مدبر اور جری ثابت کر دکھایا تھا، اسے کنیسہ کیتھولک کے مخالفین سے بھی سخت جنگ کرنی پڑی تھی یہاں تک کہ اسنے ان تمام لوگوں کو، جنھوں نے پاپائے روم اور اس کی تعلیمات کی مخالفت کی تھی شہر بدر کر دیا۔

محکمۂ تفتیش جسے شارلکان نے قائم کیا تھا تاریخ کنیسہ میں نہایت بدنما داغ شمار کیا جاتا ہے اور یہ داغ اس بادشاہ کے نام اور اس کے ملک سے کسی طرح نہیں مٹایا جا سکتا۔

شارلکان کا حکومت سے علحدہ ہونے کے تین سال بعد ۱۵۵۸ء میں انتقال ہوگیا اور اس کے بعد تخت و تاج کا مالک اس کا لڑکا فلپ دوم قرار پایا، فلپ، انصرام حکومت میں اپنے باپ سے کسی طرح کم نہ تھا اور اس نے بھی اپنے باپ کے اتباع میں مخالفین کنیسہ کے اخراج و قتل کو برابر جاری رکھا۔

ان دونوں متعصب اور ظالم بادشاہوں کے دورِ حکومت میں ہسپانیہ سخت دردناک حوادث کا مرکز بنا ہوا

تھا اور اس زمانہ میں ایسے ایسے واقعات رونما ہوئے، جنھیں سننے کے بعد شقی سے شقی انسان بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب "لوتھر" جرمنی میں اصلاح مذہب عیسوی کی طرف متوجہ تھا اور قدیم عقاید سے پھیر کر لوگوں کو اپنے جدید مذہب کی طرف دعوت دے رہا تھا۔ اول اول تو حکومت نے کوئی خاص توجہ اس طرف نہیں کی، لیکن جب لوگ جوق در جوق اس مسلک میں شامل ہونے لگے تو قدامت پرست اہل روما اس خطرناک تحریک سے چیخ اُٹھے اور انھوں نے یکزبان ہو کر "لوتھر" اور اس کے متبعین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے یورپ کے مسیحی بادشاہوں سے امداد کی درخواست کی۔

شارلکان نے فوراً اس دعوت کو قبول کر لیا اور ہر ممکن طریقہ سے اس کے استیصال پر آمادہ ہو گیا چنانچہ شارلکان کے محکمہ تفتیش نے ہر طرف جاسوس پھیلا دئے اور متہمین کو جلاوطنی اور آگ میں ڈالنے کی سزا دی جانے لگی، یہاں تک کہ ہسپانیہ کے ہر گلی کوچے سے دردناک صدائیں بلند ہونے لگیں۔

ڈاکٹر "کازالا" جو ہسپانیہ کے دارالسلطنت مڈرید میں قصر شاہی کے بالکل قریب رہتا تھا اور وہاں کے کنیسہ کا کاہن تھا، "لوتھر" کا مسلک اختیار کرنے کے لئے روانہ ہوا اور جب وہاں سے واپس آیا تو پوشیدہ طور پر اس جدید مذہب کی تبلیغ شروع کی، ڈاکٹر کازالا کا خیال تھا کہ "لوتھر" جو کچھ کہہ رہا ہے بالکل حق ہے، اور اس کے مخالفین صریح غلطی پر ہیں۔

ڈاکٹر ذکور نے واپسی کے بعد "بلدالولید" میں اقامت اختیار کی، کیونکہ وہاں اس کی ایک اچھی خاصی جماعت قائم ہو چکی تھی، اس نے اس کا نام "لوتھریا" رکھا۔

اسی اثناء میں شارلکان کا انتقال ہو گیا، تخت پر اس کا لڑکا فلپ ثانی بیٹھا، اس نے مخالفین کنیسہ کی نگرانی کی طرف اور زیادہ توجہ کی اور آخر کار اس کے جاسوس اس جگہ کے معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں ڈاکٹر کازالا اپنے متبعین کے ساتھ مجتمع ہوا کرتا تھا۔ ایک رات کو فوج نے اس مکان کا اچانک محاصرہ کر لیا اور تیس آدمی گرفتار کر کے محکمہ تفتیش کے حوالے کر دئے گئے۔

ڈاکٹر کازالا مع اپنی بہن اور بھائی کے بھاگا، مگر فوج برابر پیچھا کرتی رہی۔ اور جامعۂ قرطبہ تک پہونچی جہاں ڈاکٹر کازالا نے اس خیال سے پناہ لی تھی کہ شاید یہاں تک حکومت کے افراد نہیں پہونچ سکتے ڈاکٹر کے بھائی بہن قصر حمرا میں جان بچانے کی غرض سے چھپے ہوئے تھے، لیکن فوج ان کی تلاش میں بالآخر کامیاب ہوئی اور انھیں بھی گرفتار کر کے محکمہ تفتیش کے سپرد کر دیا، محکمہ تفتیش نے ان کے متعلق دو روز تک غور و خوض کے بعد

اپنا فیصلہ صادر کر دیا.....

اگر اسوقت بھی کوئی سیاح ہسپانیہ کے دار السلطنت میڈرڈ میں جائے اور وہاں کے کتب خانہ میں اس زمانہ کی مطبوعہ اور قلمی تاریخ کا مطالعہ کرے تو اس کے اندر ایک مجلد قلمی وثیقہ اس کو نظر آئے گا، جس پر لکھا ہوگا کہ " ۲۱ مئی ۱۵۵۹ء کو کفار کی ایک جماعت "بلد الولید" میں جلائی گئی"

اس کی تفصیل یوں ہے:-

صبح کے وقت تقریباً ۸ بجے ولی عہد "دون کاروس" جس کی عمر اسوقت ۱۴ سال سے زیادہ نہ تھی مع اپنی بہن "جونا" کے وہاں گیا، عظمائے سلطنت، کینساؤں کے پوپ اور محکمۂ تفتیش کے صدر، جسے سراغرسانی میں بہت زیادہ شہرت حاصل تھی ولی عہد کے ساتھ تھا، "جونا" کے جلو میں نہایت خوبصورت لباس زیب تن کئے ہوئے بہت سی سہیلیاں بھی وہاں موجود تھیں، ولی عہد اور جونا دونوں وہاں جا کر ایک جگہ بیٹھ گئے اور گرفتار شدہ لوگ لائے گئے، پوپ "ملکیور کانا" نے اپنا خطبہ شروع کیا، لیکن ہنگامہ کچھ اس قدر تھا، کہ ایک لفظ بھی سننے میں نہ آسکا، اس کے بعد دوسرا پوپ آگے بڑھا، ہنگامہ بالکل فرو ہو گیا، ہر چہار جانب سکوت چھا گیا۔ اس نے ہاتھ میں چاندی کی صلیب لیکر اپنی گرجتی ہوئی آواز سے کہا کہ:- امیر اور امیرۃ کو خدا کے سامنے قسم کھانی ہوگی کہ وہ محکمۂ تفتیش کی طرف سے ہمیشہ مدافعت کریں گے" اس پر امیر اور امیرۃ نے بیک زبان آمین کہی اور وعدہ کیا کہ وہ پوپ کے مطالبہ کو ہمیشہ منظور کریں گے۔ اس کے بعد جج "فرجارا" آیا اور اس نے ملزمین کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کیا، سب سے پہلے ڈاکٹر "کازالا" کا خادم لایا گیا۔ اس کے بعد کازالا کا بھائی پھر اس کی بہن اور دوسرے تیس آدمی۔ ان میں سے سولہ کو حبس دوام کی سزا دی گئی اور چودہ کو آگ میں ڈالے جانے کی لیکن قبل اس کے کہ ان کو آگ میں ڈالا جاتا، فوج کو حکم دیا گیا کہ ان سب کا گلا گھونٹ دیں جن کے قتل کا حکم دیا گیا تھا ان میں ایک چودہ برس کی معصوم لڑکی بھی تھی جس کا نام "کانتیا نادی" تھا اس نے جلاد سے نہایت عاجزی کے ساتھ کہا کہ اسے دیر تک تکلیف میں مبتلا نہ رکھا جائے، مگر افسوس کہ اس نے یہ تمنا ایسے شقی کے سامنے پیش کی تھی جو کبھی اسے پورا نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ تمام مجرمین میں اسی کو سب سے زیادہ تکلیف دیکر قتل کیا گیا، آخر میں اسی فرقہ کے سردار ڈاکٹر کازالا کو لایا گیا۔ چونکہ شہنشاہ شارلکان اس سے بہت محبت رکھتا تھا اور اس کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا اسلئے ڈاکٹر کو زندگی کے آخری لمحہ تک قوی امید تھی کہ فیلیپ ثانی اسے معاف کر دیگا، مگر اسکی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ اسے بھی دیگر رفقاء کی طرح گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا، اس کے بعد مشتعل آگ کے حوالے کر دیا گیا۔ جنھیں زندہ جلانے کا حکم دیا گیا تھا وہ جب آگ میں پہونچنے کے بعد چیختے تھے تو سپاہی انھیں نیزوں سے مار کر خاموش کر دیتے تھے۔ محکمۂ تفتیش کی اس درندگی کی آتش شوق جب ڈاکٹر کازالا کے جلانے کے بعد بھی کم نہ ہوئی تو اس کی ماں کی قبر کھدوا کر اس کی سڑی گلی ہڈیاں نکلوائیں اور ڈاکٹر کی نعش کے ساتھ ان کو بھی آگ میں ڈال دیا۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت

محمد تخلص۔ ملک محمد نام۔ سولہویں صدی عیسوی میں بھاشا کے مشہور شاعر تھے۔ کم سنی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھا۔ فقیروں کی صحبت میں عبادت و ریاضت۔ سیر و سیاحت کا شوق ہوا پنڈتوں سے درس لیا۔ جوگیوں سے فیض پایا۔ مخدوم سید اشرف جہانگیر کچھوچھوی کے مرید ہوئے اور اودھ کے مردم خیز قصبہ جائس میں سکونت اختیار کی

جائس نگر دھرم استھانوں　　　تہاں جائے کب کینھ بکھانوں

قدرت نے حُسنِ ظاہر سے محروم کیا تھا۔ سات سال کی عمر میں چیچک سے ایک آنکھ جاتی رہی تھی۔ لیکن قلب کی صفائی۔ رموز طریقت سے شناسائی۔ اسرار معرفت سے آشنائی کی بدولت مرجعِ خاص و عام تھے۔ خود لکھتے ہیں کہ "دل میں سید اشرف کا چراغِ محبت روشن ہوا اور اس قدر صفائی حاصل ہوئی کہ ظاہر و باطن سوجھنے لگا۔ میری ایک آنکھ آئینہ کی طرح روشن تھی۔ تمام دنیا کے حسین دیدار کی خواہش رکھتے تھے اور قدمبوسی کو حاضر ہوتے تھے"۔ علاوہ عیب یک چشمی کے بدقیافہ بھی تھے۔ ریاضاتِ شاقہ۔ جپ تپ کے شدائد نے صورت بد سے بدتر کر دی تھی اور چیچک سے داغدار چہرہ ایسا بدنما ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کو بے اختیار ہنسی آتی تھی۔ خود تسلیم کرتے ہیں کہ:۔

محمد کب جو پریم کے نا رتن رکہت نا ماس
جن مکھ دیکھا سو ہنسا سنی تہہ آئی آنس

یعنی ملک محمد جو عشق و محبت کے شاعر ہیں اُن کے بدن پر نہ گوشت ہے اور نہ جسم میں خون۔ جو صورت دیکھتا ہے وہ ہنستا ہے مگر جو بات سنتا ہے وہ رونے لگتا ہے۔

نو عمری سے شاعری کی دھوم تھی اور ہندوستان کے ہر گوشے میں اُن کے دوہے اور بارہ ماسے خلائق کی زبان پر تھے۔ لیکن جس شاہکار نے اُن کو حیات جاوید عطا کی وہ اُن کی بے مثل تصنیف "پدماوت" ہے جو ہندی لٹریچر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

یہ لاجواب نظم تیس چالیس برس کی طویل مدت میں مکمل ہوئی۔ سلطان ابراہیم لودی کے عہد سلطنت میں ۹۲۷ھ[1] سے

---

[1] سن نو سے ستائیس آہے　　　کتھا ارمبھ بین کب کہے　　　(پدماوت)

اس کا آغاز ہوا۔ اور شیر شاہ سوری کے دور میں تمام ہوئی جو ۹۴۷ھ سے ۹۵۲ھ تک تخت ہمایوں پر متصرف رہا تھا۔

شیر شاہ دہلی سلطانوں　　　　چاروں کھنڈ تپی جس بھانوں

پدماوت کی تکمیل کے وقت بوڑھے ہو چکے تھے۔ مثنوی کے خاتمہ پر لکھتے ہیں "اے ملک محمد تو بوڑھا ہوا اور جوانی تیری مفت خراب ہوئی توت کے جانے سے تیرا بدن نحیف و لاغر ہوا اور نگاہ آنسو بنکر آنکھوں سے بہ گئی۔ دانتوں کے جانے سے رخسار بے رونق ہوئے۔ آواز درست نہیں نکلتی ہے۔ عقل کے زائل ہونے سے لوگ دیوانہ کہتے ہیں۔ سر نیچے لٹکا رہتا ہے۔ کانوں سے سُنائی نہیں دیتا ہے اور بال مثل روئی کے ہو گئے ہیں"۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کے اختتام کے بعد بھی مدت تک زندہ رہے کیونکہ ان کی ایک تصنیف "راگنی سورٹھ" ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جو ۹۶۹ھ یعنی عہد اکبر کی تالیف سمجھی جاتی ہے۔

مثنوی کی زبان شیریں اور فصیح بھاشا ہے۔ فارسی الفاظ کی آمیزش بہت کم ہے۔ جذبات محبت واردات عشق کی متحرک تصویروں سے مزین اور نازک تشبیہوں۔ لطیف استعاروں سے مرصع ہے۔ مثلاً یہ بیان کرنا ہے کہ مالک بعض دور افتادہ بندوں سے نزدیک ہے اور نزدیکوں سے دور ہے اس کے ثبوت میں لکھتے ہیں۔

"کانٹا ہر وقت پھول کی صحبت میں رہتا ہے لیکن گل کی بو باس اس میں کچھ اثر نہیں کرتی کیونکہ وہ ٹوٹ کر نہیں ملتا البتہ چیونٹی مٹھائی کی خوشبو پاتے ہی دوڑ کر پہنچتی ہے اور سیراب ہو جاتی ہے۔ بھونرا پھول سے دور رہتا ہے مگر کنول کے کھلتے ہی پہونچ جاتا ہے لیکن مینڈھک باغ میں موجود ہے اور خوشبو سے محروم ہے"۔

یا کوئل کی فراقِ یار میں خونفشانی اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"کوئل کو کو کرکے روتی ہے اور اُس کے آنسوؤں سے جنگل میں گھونگھچی پیدا ہوتی ہے۔ بن باسی جس جس جگہ روتی ہے وہاں گھونگھچوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خونیں آنسوؤں کا قطرہ قطرہ "پیا پیا" پکار رہا ہے۔ اس درد و مصیبت کو دیکھ کر ٹیسو کے پتے گر جاتے ہیں اور کوئل کے اشکوں سے سیراب ہو کر اُس میں لال لال پھول نکلتے ہیں"۔

اُس زمانہ میں توپوں کا نیا نیا رواج ہوا تھا۔ شاعر کا تخیل دیکھئے:

وہ بجائے شراب کے بارود پیے ہوئے اپنے چرخ پر مست پڑی رہتی ہیں لیکن دشمن کے تاراج کیلئے فوراً اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ اگر ان کو کوئی ہلانا چاہے تو ہمارے زمانہ کے زور سے نہ ہلیں مگر جس وقت رینگی زبان کھولتی ہیں تو زمین کانپنے لگتی ہے۔ جس مقام پر وہ قدم رکھتی ہیں نشیب و فراز جنگل اور پہاڑ سب برابر ہو جاتے ہیں۔

وہ معشوق کی طرح بناؤ سنگھار کئے مست رہتی ہیں مگر جس وقت سانس چھوڑتی ہیں تو آگ لگ جاتی ہے اور اُن کا دھواں آسمان تک پہونچتا ہے - اُن کی پیشانی پر سیندور مثل آگ کے روشن ہے - پہئے چرخ کے زیر پا چمکتے ہیں - پھریرا مثل آنچل کے چھٹکا ہوا ہے - زنجیریں مثل زلف کے گلے میں پڑی ہیں اور جب ہاتھی پکڑ پکڑ کر کھینچتے ہیں تو کندھے ٹوٹ جاتے ہیں "

سنگلدیپ کے راجہ گندھرب سین کی لڑکی پدماوت حسن و جمال میں لاجواب تھی ایک بولتا ہوا طوطا اُس کا ہم سبق اور ہم نشیں تھا - راج کماری سیر گلشن کو گئی - طوطے کے پنجڑے پر بلی نے حملہ کیا - طوطا جان بچا کر بھاگا اور جنگل میں اپنے ہمجنسوں کے ساتھ رہنے لگا - وہاں ایک صیاد کے دام میں اسیر ہوا - آب و دانہ کی کشش ہندوستان لے گئی اور راجہ رتن سین والی چتور کی سرکار میں فروخت ہوا -

ایک دن راجہ شکار کو گیا تھا - رانی ناگ متی بناؤ سنگھار کرکے آئینہ میں اپنا جمال دیکھ رہی تھی طوطے سے پوچھنے لگی کہ دنیا میں کوئی حسین اُس سے بڑھکر بھی دیکھا ہے - طوطا پہلے خاموش رہا مگر رانی کے مکرر استفسار پر بولا کہ سنگلدیپ کے راجہ کی بیٹی پدماوت ایسی خوبصورت ہے کہ تیرا چہرہ اُسکے کفِ پا کے برابر بھی نہیں ہوسکتا - یہ سخت جواب سنکر رانی کو طیش آیا - فیروزے پر لال ہوئی اور کنیز کو حکم دیا کہ طوطے کو ذبح کر ڈالے - لونڈی ہوشمند اور عاقبت اندیش تھی طوطے کو اپنے گھر میں چھپا لیا اور جب راجہ نے جستجو شروع کی تو اُس کو حاضر کر دیا - راجہ نے طوطے سے پدماوت کی تعریف سنی - دام عشق میں اسیر ہوا - راج پاٹ چھوڑا مال بیوی کی محبت کی زنجیر توڑی - جوگی بنکر معشوق کی تلاش میں نکلا - طوطا رہبر و ہادی تھا - جنگلوں پہاڑوں دریاؤں، سمندروں کو طے کرتا ہوا جزیرہ سنگلدیپ تک پہونچا اور بیرون شہر ایک بتخانہ میں فروکش ہوا -

طوطے نے پدماوت کو جاکر اطلاع کی کہ چتور کا راجہ تیرے عشق میں دیوانہ ہوکر جوگیانہ بھیس میں آیا ہے - پتھر کا دل موم ہوا - پدماوت نے زبان دی کہ وہ بسنت کے دن پوجا کے لئے بتخانے جائے گی اور اُس جوگی کو دیکھے گی - وعدہ کے موافق وہ آئی مگر راجہ تاب نظارۂ دیدار نہ لاسکا - ایک ہی جلوہ میں بیہوش ہوگیا اور سر و پا کی خبر نہ رہی - رانی نے صندل سے اُس کے سینے پر لکھا " تو جوگی بنا لیکن جوگ نہ سیکھا جب ملاقات کا وقت آیا تو سوگیا - تیرا مطلب کیونکر حاصل ہوسکتا ہے " جب راجہ کو ہوش آیا تو معشوق رخصت ہوچکا تھا - ندامت اور افسوس سے خودکشی کا ارادہ کیا - لکڑیاں جمع کرکے بتخانہ میں آگ لگانے اور جل مرنے کا عزم بالجزم کرچکا تھا کہ ملکوت میں غلغلہ پڑا - مہادیوجی نے درشن دئے اور قلعہ میں داخل ہونیکا ایک پوشیدہ راستہ بتایا جس کے لئے سانس روک کر گرداب میں غوطہ زنی کی ضرورت تھی -

رتن سین ہدایت پر عمل پیرا ہوا - قلعہ کی دیوار پر چڑھتا تھا کہ پاسبان ہوشیار ہوگئے - گرفتار کیا گیا

اور سولی کا حکم ملا۔ اُس نے موت قبول کی مگر اپنا راز ظاہر نہ کیا اور منزل دلدار کے قریب جنگ و جدال کا روادار نہ ہوا۔ تب مہادیوجی بھاٹ کے بھیس میں گندھرپ سین کے پاس گئے رتن سین کی خاندانی شرافت اور عالی نسبی سے آگاہ کیا۔ طوطے کی گواہی دلوائی اور آخر کار اُن کی سفارش و سعی سے رتن سین کا پدماوت سے عقد ہو گیا۔

ادھر رانی ناگ متی رتن سین کے فراق میں دیوانہ وار جنگل میں گھوم رہی تھی اور اُس کی آہ سوزاں سے وحوش و طیور کو تکلیف تھی۔ ایک طائر بہنگم نام کو اس کے حالِ زار پر ترس آیا اور رانی کا نامۂ شوق لیکر رتن سین کی تلاش میں نکلا۔ سنگلدیپ میں رتن سین سے ملاقات ہوئی۔ خط دیکھتے ہی ناگمتی کی یاد نے بے چین کیا اور وطن کی واپسی کا اشتیاق پیدا ہوا۔

گندھرپ سین کی اجازت سے سفر کا آغاز کیا مگر اب طوطا رہبری کے لئے ہمراہ نہ تھا۔ سمندر کے قریب پہونچے تو ایک برہمن دان مانگنے آیا۔ راجہ نے اُس کا سوال رد کر دیا۔ دیوتا ناراض ہوئے۔ طوفان آیا۔ جہاز ٹوٹ گیا۔ رتن سین اور پدماوت کا ساتھ چھوٹا۔ عرصہ کے بعد یکجائی ہوئی اور صعوبات برداشت کرکے چتور پہونچا۔ ایک ساحر راگھو نام سنگلدیپ سے ساتھ آیا تھا اس سے راجہ خفا ہوا اور شہر بدر کرنے کا حکم دیا رخصت کے وقت پدماوت نے اپنا ایک کنگن مدد خرچ کے لئے عنایت کیا۔ وہ ساحر دہلی پہونچا اور سلطان علاء الدین خلجی کی سرکار میں ملازم ہوا۔ پدماوت کے حسن کی تعریف کی اور کنگن دکھایا۔ سلطان نادیدہ عاشق ہوا۔ چتور پر فوجکشی کی۔ مدت تک جنگ کا بازار گرم رہا مگر نہ ایں را خطرہ نہ آں را ظفر۔ آخر صلح ہوئی۔ سلطان قلعہ چتور میں گیا۔ راگھو کی شرارت سے آئینہ میں پدماوت کا عکس دیکھا اور حکمت عملی سے رتن سین کو گرفتار کرکے دہلی لے گیا۔ پدماوت نے رتن سین کے بھانجوں کو جنگ پر مستعد کیا۔ وہ فوج لیکر دہلی چلے اور مشہور کیا کہ پدماوت بہ نفس نفیس علاء الدین سے ملنے جاتی ہے۔ شہر کے قریب پہونچکر سپاہیوں کو ڈولیوں پر سوار کرایا۔ دھوکے سے رتن سین کو آزاد کرا کے چتور بھجوادیا اور خود لڑتا جھگڑتا پسپا ہوا۔ رتن چتور پہونچا تو معلوم ہوا کہ اُس کی غیبت میں جوار کے ایک راجہ نے پدماوت سے عشق کا اظہار کیا تھا۔ رقیب کے قتل کی قسم کھائی اور دوسرے دن اُس سے لڑنے چلا۔ دشمن کو زیر کیا مگر خود بھی جنگ میں زخمی ہو گیا۔ گھر واپس آکر مر گیا اور اُس کے ساتھ ناگمتی اور پدماوت بھی ستی ہو گئیں۔

اس اثنا میں علاء الدین خلجی بھی لڑتا ہوا چتور تک پہونچ گیا تھا۔ شہر کے دروازہ پر پدماوت کے دردناک انجام کی خبر ملی۔ چتا سے راکھ اُٹھا کر اپنے سر پر ڈالی اور سخت حسرت و افسوس سے دہلی واپس گیا۔

سنی تم نے عزیزو یہ کہانی کہ ہے اللہ باقی کل فانی

مورخانہ نقطۂ نگاہ سے داستان میں صدق کا عنصر بہت تھوڑا ہے۔ ۱۳۰۳ء میں علاء الدین خلجی کا چتور پر حملہ ہندوستان کی کتب تواریخ میں مذکور ہے لیکن ضیاء الدین برنی وغیرہ چودھویں صدی کے وقائع نگار رانی پدماوتی کا تذکرہ نہیں لکھتے البتہ فرشتہ نے مجملاً پدماوت کا دردناک انجام بیان کیا ہے اور کرنل ٹاڈ نے "راجستان" میں اس قصہ کو زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اگرچہ زمانۂ حال کے محقق یہ رنگ آمیزی پایۂ اعتبار سے ساقط تصور کرتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ مغلیہ سلطنت کے ابتدائی دور میں بھاٹوں اور پنڈتوں کی زبان پر رتن سین اور پدماوت کے عشق کی کہانی تھی اور انھیں متفرق افسانوں کو یکجا کر کے ملک محمد نے یہ داستان ترتیب دی تھی جس میں تصوف کے نکات۔ معرفت کے اسرار۔ اور سالکانِ طریقت کے منازل و مقامات کی تشریح کی تھی۔ مثنوی کے خاتمہ پر خود لکھتے ہیں کہ:-

"ہفت طبق آسمان اور ہفت طبق زمین انسان کے جسم میں موجود ہیں میں نے اس نظم میں تن سے چتور روح سے رتن سین - دل سے سنگلدیپ - پدماوت سے معشوق حقیقی - طوطے سے مرشد - ناگمتی سے دنیا - راگھو سے شیطان - علاء الدین سے ہوا و ہوس کی تمثیل بنائی ہے۔ جو محبت کا مذاق رکھتا ہے اس سے لطف اُٹھائے گا اور جو سنے گا اس کو دردِ عشق حاصل ہوگا"

مصنف نے اپنی نظم کے اسرار و غوامض سے اتنا ہی پردہ اُٹھایا ہے لیکن مثنوی غور و تعمق سے دیکھی جائے تو اس میں جگہ جگہ نکات تصوف کا بیان ہے۔ امراض روحانی سے خبردار کیا ہے۔ حصول عرفان کے نسخے لکھے ہیں۔ سالکِ طریقت کے منازل و مراحل کا نشان دیا ہے۔ عالم ناسوت کی سیر۔ جنگلوں پہاڑوں اور دریاؤں کے سفر میں ظاہر کی ہے۔ سنگلدیپ کے بتخانے میں ملکوت کا تماشہ ہے۔ پہلی تجلّی کے بعد بیہوشی اور حسرت و ندامت سے خودکشی کا عزم۔ منازل قبض و بسط کے نمونے ہیں۔ مہادیوجی نے قلعہ میں داخل ہونے کا جو راستہ تعلیم کیا وہ حبسِ دم سے لطیفۂ قلب کے کشود کا طریقہ ہے۔ رتن سین کو کامیابی اُسوقت ہوئی جب مہادیوجی نے گندھرپ سین کے دربار میں طوطے سے گواہی دلوائی اور وہ اس صوفیانہ رمز کی طرف اشارہ ہے کہ کشود کار بغیر توجہ مرشد کے ممکن نہیں۔ سنگلدیپ سے چتور کی طرف واپسی فنا فی اللہ کے بعد بقا باللہ کی تمثیل ہے۔ ہوا و ہوس میں گرفتاری بشریت کا تقاضا ہے اور چتا کی راکھ سر پر ڈالنا اشارہ ہے کہ ہوس کی آگ صرف خاک ہی سے بجھ سکتی ہے۔

جائسی لکھتے ہیں کہ رتن سین راگ کا شیدائی تھا مگر جب منزل اعلیٰ پر پہونچا اور پدماوت کے محل میں دعوت ہوئی تو قسم قسم کے کھانے مہیا کئے گئے لیکن سماع کی اجازت نہیں دیگئی۔ اس مضمون کو اُردو مترجم یوں نظم کرتا ہے:-

یہ سب تھا پر نہ تھے واں راگ گاتے   تھے راجہ راگ بن کچھ بھی نہ کھاتے
کیا جب تو تشنجاں اُس نے نہ کچھ واں   ہوئے انگشت حیرت سب بدنداں

براتی اور مصاحب تھے جو بیٹھے
سبھوں نے اپنے اپنے ہاتھ کھینچے
برہمن دست بستہ رو برو آ
لگے کہنے کہ موجب اس کا فرما
دقیقہ کوئی ہم سے کم ہوا ہے
کہ جس باعث سے تو برہم ہوا ہے
جو فرماؤ منگاویں ہم ابھی زود
وہ کیا ہے جس سے دل تیرا ہو خوشنود
ہوا وہ دُرفشاں اپنی زباں سے
کہا جلدی گروہِ بید خواں سے
یہ عقدہ مجھ کو ہے در پیش لاحل
طعام اول ہے یا ہے راگ اول
درِ دل راگ سے ہوتے ہیں مفتوح
کہ آئی جسم میں ہے راگ سے روح
انھوں نے عرض کی اس سے کہ اے ماہ
مقرر سالکوں نے کی ہیں دو راہ
جو راہِ علم ظاہر پر ہیں قائم
نہ دیویں ان کو رخصت راگ کی ہم
جو باطن میں ہیں مستِ جامِ اُلفت
انھیں کو چاہیئے اس کی سماعت
کہ بس ان کی وہی ہے منزلِ وصل
بغیر از راگ ہے اُن کے تئیں فصل
کیا جس واسطے تھا ترک آرام
ہوا سو اب تمھارا آخر انجام
چھٹی تن سے تمھارے خاکِ دوری
ہوئے اب تم نہا دھو شکلِ نوری
مگر جو یہ تمھارے ساتھ ہیں یار
اگر ان کو ہو اس کا شوق سرشار
کہو ان سے الگ جا اس مکاں سے
کریں دل شاد اب رقصِ بتاں سے

غرض ملک محمد کی پدماوت اسرار تصوف کا گراں بہا گنجینہ ہے اور ایک مدت تک ارباب محبت کے حلقوں میں اُس کی بڑی قدر و قیمت رہی۔

جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب اقبال لب بام آیا اور دوئے معلّٰی نے برج بھاشا کی جگہ لی۔ شہروں کے بسنے والے سنسکرت آمیز ہندی کی جگہ فارسی آمیز اُردو بولنے لگے۔ پدماوت سے لطف اندوز ہونے والے اُنگلیوں پر شمار کرنے کے قابل رہ گئے اور آج ہندوستان میں چند ہی مسلمان ایسے ملیں گے جو بغیر ترجمہ اور شرح کے ملک محمد کے بلند تخیلات سے مستفید ہو سکیں۔

تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں میر ضیاء الدین دہلوی متخلص بہ عبرت کو شوق پیدا ہوا کہ وہ پدماوت کی داستان ریختہ میں نظم کریں اور جائسی کے خیالات سے اپنے ہمعصروں کو جو بھاشا فراموش کر چکے تھے روشناس بنائیں۔ عبرت حکیم تھے۔ رامپور میں مطب کرتے تھے۔ نواب نجو خاں رئیس کے انیس و جلیس تھے شعر و سخن سے ذوق تھا۔ نواب فیض اللہ خاں والی رام پور کی تعریف میں اُن کا ایک شعر

مدت تک ضرب المثل رہا تھا۔

جو بکری مانگے اُس کو فیل بخشے   صدف مانگے تو موتی جھیل بخشے

جرأت و مصحفی کے ہم صحبت نواب محبت خاں کے شاگرد رشید تھے۔

مضامیں کس طرح کرتا میں ایجاد   نہ ہوتا گر محبت خاں سا اُستاد

منازل سلوک و مراحل تصوف سے بھی دلچسپی تھی۔ سرخیل مقبولان درگاہ سید حسن شاہ کے مرید تھے۔

جہاں پر نام وہ مذکور ہووے   زباں جیوں برگ نخل طور ہووے

مسئلہ وحدت الوجود سے آشنائی تھی۔

ہر اک عالم کو گوناگوں بنایا   وہ بیچون وچگوں "چوں" میں در آیا
ہزاروں شان میں ہو کر وہ گزرا   کبھی دامن بنا وہ گاہ عذرا
ہے سب شکلوں میں اُس کا ہی یہ مظہر   پران سب صورتوں سے ہے وہ باہر
ہے سب کے پاس وہ اور سب سے ہے دور   ہے سب رنگوں میں دیدا پنی ہی منظور
ہر اک جا میں ہے گو اُس کی جدا آن   وسے ہر آن میں ہے وہ کما کان

پدماوت کا قصہ ریختہ میں نظم کرنے کا عزم کیا تو دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ مسلمان ہو کر ہندو راجہ کا قصہ لکھنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

کہے کوئی کہ عبرت سا مسلماں   ہوا ہے عشق کافر سے سخن راں

لہٰذا دفع دخل کرتے ہیں۔

کہ عشق آزاد ہے گا کفر و دیں سے   نہیں کچھ کام اُسے شک و یقیں سے
وہ ان دونوں ہی عالم سے ہے آزاد   کرے ہے کفر و دیں دونو کو برباد
نہیں کچھ مانتا عشق ستمگار   کہ کیا تسبیح ہے اور کیا ہے زنار
اُسے معشوق و عاشق کا نہیں غم   وہ دونوں کو کرے رسوائے عالم
کرے ہے روشن اپنا شعلہ جب دم   جلادے شمع و پروانے کو باہم

ملا غنیمت کی استاد و شاہد کی روداد فارسی لٹریچر کا قابل یادگار کارنامہ ہے۔

بہ مکتب سپرد طفل پریزاد   مبارک باد مرگ نوبہ اُستاد

لیکن عبرت کا مکتب زمانہ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ پدماوت تحصیل علوم کے لئے ایک برہمن کے سپرد کی گئی

سبق اس کو برہمن کیا پڑھاتا   کہ مثل مرغ بسمل خود پڑا تھا

لگی پڑھنے وہ بسم اللہ جب پدم — برہمن ہو گیا مجموعۂ غم
جو کی اُس نے نگاہ عشق انگیز — ہوا ہر لفظ صد معنی سے لبریز
وہ گل جس صفحہ پر ہوتی سبق خواں — نظر آتا وہ اک جزوِ گلستاں
سبق کو بھول کر وہ غارت ہوش — تبسم کر کے ہو جاتی تھی خاموش
برہمن مثل مستانِ خرد گم — شہید جلوۂ تیغ تبسم
یہ کہتا تھا کہ کمتر ہنس شکر لب — کہ مصری تیغ یہ کاٹے ہے بیڈھب

رتن سین سلطنت چھوڑ کر فقیرانہ لباس اختیار کرتا ہے۔ ماں سے رخصت ہونے محل میں جاتا ہے اور سفر کی اجازت طلب کرتا ہے۔

کہ اے ماں سفر اب سر پہ آیا — مجھے کرتا ہے اب تجھ سے پرایا
نہیں ہے حق ترا مجھ کو فراموش — ہے تیرے دودھ کا مجھ میں ابھی جوش
کہ تو نے اُلفت و شفقت سے مائی — مجھے بتیس دھاریں ہیں پلائی
شجر جوں گل کا ہو پانی میں آیا — تو بھیگی مجھ کو سوکھے پر سلایا
تو میرے غم میں یہ جاگی کہ اک پل — لگیں تیری نہ پلکیں مثل مخمل
جو کچھ کی تو نے مجھ پر جانفشانی — کہوں کیا سب تری تھی مہربانی
برنگِ لعل تو نے مجھ کو پالا — بسانِ مہر مجھ پر سایہ ڈالا
میں زریں تاج سے جوں شعلہ بیزار — ہوا ہوں عشق کے ہاتھوں سے ناچار
کہ رکھ کر عشق نے اب داغِ سوزاں — بنایا دل مرا سروِ چراغاں
جو انگارے کی صورت دل جلا ہے — بھبوت اب راکھ کا میں نے ملا ہے
یہ کنڈل کان میں جو میں نے پہنا — ہوا حلقہ بگوش اب اک پری کا
نگین و تاج و تخت و ملک و کشور — کیا میں نے فدائے نامِ دلبر
پدم کے واسطے جوگی ہوا ہوں — سفر کی تجھ سے رخصت مانگتا ہوں
جو کچھ میں نے کہا ہو بخش دیجیو — دعا کے ساتھ مجھ کو یاد کیجیو

ماں نے بیٹے کو بہت سمجھایا اور سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر عشق کے مجنوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔

جو دیکھا ماں نے ہے یہ سخت مجنوں — اثر اُس پر نہ ہوگا کوئی افسوں
وہیں زلفوں کے اُس نے بال جھٹکے — اُکھاڑے عنبر افشاں بال لٹ کے

وہ بال اُسکی کلائی پر لپیٹے
بلائیں اُسکی لیکر بولی بیٹے

ہوا جو تو قلندر وضع آزاد
یہ دل سے میری سمرن کیجیو یاد

جو تو دُلہن کے گھر جائے گا جانی
یہ کنگنا اُس گھڑی ہوگا نشانی

پھر اپنا سر جو تھا لوہو میں ڈوبا
پسر بیچارہ کے پاؤں پہ رگڑا

کہ بیٹا میں یہ ہوں مہندی (لہو) لگاتی
پدم کا تجھکو ہوں نوشہ بناتی

یہ میرے اشک جاری ہیں جو بیشمار
گلے میں موتیوں کے ڈال لے ہار

رتن سین کی بیوی ناگمتی نے اس سے بھی بڑھکر ستم کیا۔

پھر اُس نے چیر کر بائیں چھنگلیا
جبیں پر قشقہ اس جوگی کے کھینچا

کہ لے جاتا نہیں گر مجھکو پیارے
مرا لوہو لئے جا ساتھ بارے

میں گو نظروں میں او گل تیرے ہوں خار
نہ چھوڑوں (لہو) گی پر ان قدموں کو زنہار

تو اسباب سفر اب تن سے کر دور
نہیں یہ سر مرا گردن سے کر دور

نہیں معلوم مجھ کو سوتیا ڈاہ
ملے تو جبکہ اُس معشوق سے آہ

مرا مرنا سنا کر شاد کیجو
یہی اول مبارکباد دیجو

جب ان باتوں سے کام نہ نکلا تو ناگمتی بھی جوگن بنی -

وہیں جیوں شمع فانوس خیالی
گلے میں اوڑھنی کی کفنی ڈالی

بھبوت اپنے طلا چہرے کے اوپر
دبایا راکھ میں انگار لیکر

کیا نتھ کو رخِ دلخواہ سے دور
کیا ہالہ کو اپنے ماہ سے دور

وہ زیور موتیوں کا سب اُتارا
نہ چھوڑا مہر نے کوئی ستارا

وہیں رو رو کے رستہ جا کے گھیرا
کہ اے جوگی کرے گا کب تو پھیرا

تو کیونکر جائے گا میرے سنگاتی
میں ہوں الماس اشک اس جا بہاتی

تو مجھ جوگن کو ساتھ اپنے لئے جا
پھروں گی میں لئے تیرا یہ میتا[۱]

جو کانٹا پاؤں میں دیکھوں گی تیرے
نکالوں گی میں پلکوں کی سوئی سے

جہاں دیکھوں گی اُڑتی گردِ صحرا
کروں گی اشک سے چھڑکاؤ اُس جا

۱؎ میتا ہندی میں کاسۂ گدائی کو کہتے ہیں۔

جہاں پر دھوپ ہوگی واں شتابی — ترے منھ کی بنوں گی آفتابی
جہاں تو بیٹھ کر باندھیگا آسن — سر اپنا میں کروں گی واں سنگاسن
تری راحت کو بہر دفع گرما — کروں گی سائباں پلکوں کا برپا
نہ ہرگز کنکروں پر سوئے گا تو — میں سر کے بالوں سے دیدوں گی جھاڑو
اندھیری شب ہو جس جنگل میں باسا — جلاؤں گی دل اپنا شعلہ آسا
رتن جام محبت سے تھا مدہوش — کسی کی بات پر اس کو نہ تھا گوش
نہ رانی کو جواب اُس نے دیا کچھ — نہ اوروں سے خطاب اُس نے کیا کچھ
گیا در سے جو وہ جوگی نکل کر — وہ نرگس کی طرح تکتی رہی در
جو آئی ہوش میں پھر وہ دوانی — کہا کرتی تھی جوگی کی کہانی

اگر عبرت کی زندگی وفا کرتی اور ساری داستان اسی درد آمیز لہجہ میں نظم ہو جاتی تو ادب اُردو کی تاریخ میں مثنوی سحرالبیان کے بعد پدماوت کا نام لکھا جاتا لیکن وہ قصہ کا چہارم حصہ لکھ پائے تھے اور اُس مقام تک پہونچے تھے کہ رتن سین سنگلدیپ کے بتخانہ میں فروکش ہوا اور طوطے نے اُس کے حالِ زار سے پدماوت کو آگاہ کیا کہ عبرت کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا اور وہ اپنا کام ناتمام چھوڑ کر ملک جاودانی کی طرف راہی ہوئے سات آٹھ برس تک تکمیل داستان کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ آخر کار سید غلام علی مشہدی ساکن بریلی نے جو بیک واسطہ مرزا رفیع سودا کے سلسلہ میں داخل تھے اس افسانہ کو تمام کیا۔

سبب تالیف مصنف کی زبان سے سنئے کیونکہ ڈیڑھ سو برس پہلے کی نثر اُردو کا نمونہ ہے:-

"مخفی نہ رہے کہ بندۂ ہیچمداں علم سخن سنجی اور سرگرداں سرائے سرپنجی خاکسار بے مقدار سید غلام علی مشہدی متخلص بہ عشرت ساکن بریلی - ابجد خوان دبستان مرزا علی لطف صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ کہ ذات بابرکات اُن کی ذوق یاب شعر و شاعری کی کلام کرامت نظام مرزا رفیع السودا مرحوم مغفور سے ہے بلکہ شاگرد رشید اُن کے ہیں چندروز سے ۱۲۱۱ھ میں درمیان شہر رامپور کے کہ نام خاص اُس شہر بلند اور بلدۂ ارجمند کا مصطفےٰ آباد ہے بجہت اُلفت بعضے یاران نکتہ پرداز اور دوستان محرم راز کے وارد تھا بلکہ بیچ سرکار فیض آثار گوہر درج فتوت اختر برج مروت شوکت و شہامت پناہ حشمت و جلالت دستگاہ خانصاحب مشفق فیض رساں مظہر کرم والاحسان محمد عثمان خاں واحمد خانصاحب سلمہما الرحمٰن کہ خاندان عالیشان نواب معلےٰ القاب فیض اللہ خاں مرحوم و مغفور کی سوائے رشتہ خواہرزادگی کے نسبت فرزندی کی بھی رکھتے ہیں سررشتہ روزگار کہ ہر دنیا دار کے تئیں جستجو اُس کی ضرور ہے اور ہر ایک باشندہ اس بازار کا لیل و نہار

بہ فکر روزگار تگاپو میں مجبور رہتا تھا۔ چنانچہ ایک مجلس مشاعرہ میں مولوی صاحب فیض رسان سلمہ الرحمن نے باصد زیور تقریر فصاحت آمیز و باہزاراں لباس تحریر بلاغت انگیز اوپر تحت مرصع کلام عشق القیام کے اس طور پر جلوہ نمائش کا دیا کہ ایک عزیز پر تمیز جوانِ رعنا یوسفِ مصر فصاحت و بلاغت ماہ کنعانِ رزانت و متانت بازیور علوم دینی آراستہ و بالباس قابلیت و فنون دنیوی پیراستہ نخلبند گلستان مضامین رنگین چاشنی افزائے شکرستان لفظ و معنی شیرین اختر برج سیادت گوہر درج سعادت میر ضیاء الدین نام متخلص بہ عبرت متوطن شاہجہاں آباد خوش باش قصبۂ رامپور ہمارے آشنا تھے...... انھوں نے قصہ راجہ رتن سین اور پدماوت کا کہ زبان پوربی میں تصنیف مولانا ملک محمد جائسی کا ہے زبان ریختہ میں تصنیف کرنا شروع کیا اور بقدر اپنے کوئی دقیقہ شعر و شاعری کا فوت و فروگزاشت نہ کیا۔ القصہ چہارم حصہ اس قصۂ غریب کا بہ نکات عجیب و لطیف و مضامین رنگین دلفریب قلم معنی رقم اپنے سے تحریر و تسطیر کیا کہ میر ضیاء الدین عبرت کو مرض الموت ہوا اور ساتھ حسرت و غم ناتمامی اس داستان ندرت بیان کے دار الفنا سے طرف دار البقا کے قدم رنجہ فرمایا۔ اب عرصہ سات آٹھ برس کا گزرا کہ کوئی موزوں طبع کچھ کچھ اپنے جی میں سمجھ کر واسطے تمام کرنے اس کلام درد التیام کے دست انداز نہوا۔ مہربان من اب التدعا اور آرزو ہم مشتاقوں کی یہ ہے کہ بہ سبب فکر تمھاری کے یہ قصہ عجیب و غریب باقی ماندہ ہیچ مسلک نظم آبدار کے آب و تاب انتظام کی پاوے اور ہر ایک مشتاق سیر اس گلستان مضامین اور معانی سے حظِ وافر اٹھا دے...... اے یاران محرم راز و اے مشفقان بندہ نواز میں نے پاس خاطر عاطر سے باقی ماندہ یہ قصہ عجیب و غریب بہ کاوش بسیار و فکر بے شمار عرصہ یک و نیم ماہ میں ساتھ اس جلدی کے کہ انصرام پانا اس کلام کا محال تھا تمام کیا اور منظور خاص و عام و جمہور انام کا ہوا۔"

غرض ۱۲۱۱ھ میں عشرت نے ڈیڑھ مہینہ میں یہ قصہ تمام کیا اور "تصنیف دو شاعر" مادۂ تاریخ اتمام تجویز کیا۔

یہ کہہ کر مثنوی میں نے جو کی غور
کوئی تاریخ اس کی کہیے خوش طور
کہا دل نے اسے دیکھے جو ماہر
بلا شک جانے تصنیف دو شاعر
۱۲۱۱ھ

عشرت کے کلام کا رنگ ملاحظہ ہو:-

علاء الدین نے ایک دلالہ کو پدماوت کے بہکانے کے لئے چتور بھیجا۔ وہ جوگن کے بھیس میں جاتی ہے

پہن کر سب لباس گیروا بائی
سراپا شکل جوگن کی بنائی
وہ مندے کان میں غارتگر ہوش
دلِ عالم ہو جس کا حلقہ در گوش

وہ حلقہ سر پہ جیسے مہ پہ ہالا
اور اک کاندھے پہ رکھے مرگ چھالا

بھبوت اپنے وہ تھا منہ پر لگایا
کہ آئینہ کا جس نے ہوش اُڑایا

مسافر خانہ میں آکر وہ پرفن
جو بیٹھی جوگیا نہ مار آسن

بچھا کر مرگ چھالا اک جگہ پر
دھیان اور گیان میں کہتی تھی ہر ہر

دھیان اور گیان میں وہ نازنیں ہے
کوئی دم یاد سے غافل نہیں ہے

جو اُٹھتی بیٹھتی وہ مہ لقا ہے
سہارے کو عصا یادِ خدا ہے

دم اپنے کی ہے سارنگی بناتی
اسی اک تار کو ہر دم بجاتی

غرض جو چاہئے عشاق کے راز
لگاتی ہے اُسی پردے سے آواز

رتن سین نے سنگلدیپ جاکر پدماوت سے شادی کی اور یارانِ وطن کو بھول گئے۔ اُن کی عاشق زار رانی ناگمتی شوہر کے فراق سے بےچین ہے۔

جگر تھامے ہوئے غمگین و بیتاب
پھرے تھی لوٹتی مانند سیماب

کبھو وحشت میں آ باہر نکلتی
اُٹھا کر خاک گاہے منہ پہ ملتی

کبھو زانو پہ سر رکھ کے وہ ناچار
کسی جا بیٹھ رہتی شکلِ بیمار

کبھو منہ ڈھانپ کر اپنا وہ روتی
تڑپتی اور بلکتی جان کھوتی

کبھو دیوانہ ساں بکتی وہ دلگیر
کبھو خاموش رہتی مثلِ تصویر

کبھو بےتاب ہو کر در پہ آتی
جگر تھامے ہوئے پھر گھر میں جاتی

خیال اکدن یہ اس کے جی میں آیا
کہ دل بہلاؤں اپنا باغ میں جا

تصور دل میں کر قدِ رتن کا
تماشا دیکھئے سروِ چمن کا

نظر آتی نہیں چشمِ رتن سین
تو دیکھوں چشمِ نرگس کو میں بےچین

جو یاد آوے گی وہ زلفِ پریشاں
تو سنبل پر کروں گی جان قرباں

یہ جی میں ٹھان کر وہ غیرتِ باغ
برنگِ لالہ گلشن لئے داغ

محل سے آئی گلشن میں خراماں
کئے مانند گل ٹکڑے گریباں

زبس غم سے وہ سرگرمِ فغاں تھی
کہے تو عندلیبِ بوستاں تھی

غرض آئی تھی بہلانے کو وہ دل
ہوئی سو آکے دونی مرغِ بسمل

برنگِ غنچہ ہو گلشن سے دل تنگ
چلی صحرا کی جانب کر کے آہنگ

بگولے کی طرح وہ مضطرب حال پھرے تھی بس غمِ اُلفت کی پامال
یہ آتش اُس کی آہوں سے تھی پیدا کہ جس سے دشت سارا جل گیا تھا

ناگمتی رتن سین کے نام اشتیاق نامہ لکھتی ہے اور ایک طائر نامہ بری کا وعدہ کرتا ہے۔ خط کا مضمون یہ ہے:۔

رفیق و دستگیرِ جانِ ناشاد رتن شاداں سلامت دائما باد
گیا ہے جب سے تو اے راحتِ جان نہیں آرام و تسکیں مجھ کو اک آن
برنگِ لالہ ہوں میں داغ بردل ہے دردِ دل سے دم لینا بھی مشکل
ترے بن اے گُلِ باغِ جوانی پھروں ہوں مثلِ بلبل میں دِوانی
گیا تو بن کے جب سے شکلِ جوگی میں جوگن ہوں ترے غم کی بروگی
کوئی کرتا بھی ہے کام اس طرح کا کیا اے بےمروت تو نے جیسا
خیالِ غیر سے واں تو ہم آغوش یہاں میں مرگ سے ہوں دوش بردوش
ہے تو ہمراہ اوروں کے بہ گلزار میں خارِ رشک سے مجروح و افگار
کیا تو نے مجھے دل سے فراموش یہاں میں یاد سے تیری ہم آغوش
خدا جانے تجھے کس نے لبھایا کر تو نے دل سے مجھ کو یوں بھُلایا

عشرت کے بیان میں وہ درد نہیں جو سرکار ازل سے عبرت کے حصہ میں آیا تھا۔
عشرت کی زبان میں وہ لوچ نہیں جو شاہ جہاں آباد کی خاکِ پاک نے عبرت کی سرشت میں ودیعت رکھا تھا۔

عشرت کو فنِ تصوف سے وہ ذوق نہیں جو عبرت کو درویشوں کے خوانِ نعمت سے ملا تھا۔
روزمرہ دونوں کا قدیم ہے۔ اتنا - تلک - پرتے - لوہو - وو ہیں - ہیگا - گہا دتے - تئیں وغیرہ متروک الفاظ دونوں استعمال کرتے ہیں۔ رعایت لفظی پر دونوں جان دیتے ہیں۔ جائسی کی تشبیہات اور نازک خیالیوں سے دونوں مستفید نہیں ہوتے۔ محاورات نظم کرنے میں قواعد نحو کا لحاظ نہیں رکھتے۔ تعقید کو معائب سخن میں شمار نہیں کرتے۔ بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث بھی عام رواج کے خلاف ہے لیکن اُسوقت تک بندش کی صفائی اساتذہ کے کلام میں بھی کالمعدوم تھی۔ نثر آج کی نظم سے زیادہ مغلق اور پیچیدار ہوتی تھی۔ غزل "ریختہ" کی منزل سے آگے نہ بڑھی تھی اور واقعہ نگاری پر کسی شاعر کو الا ماشا اللہ قدرت نہ تھی۔

میر حسن نے اپنی لاجواب مثنوی سحر البیان اس نظم سے چند سال پہلے تمام کی تھی جس کی فصاحت بیان شیرینیِ زبان۔ صفائی بندش پر آج ہونے دو سو برس کے بعد بھی حرف رکھنے کی گنجائش نہیں۔ نہ اُس سے پہلے

ایسا صاف روزمرہ کسی واقعہ نگار نے نظم کیا تھا اور نہ اس کے بعد پچاس ساٹھ برس تک کوئی مثنوی گو اُس کی تقلید کر سکا لیکن یہ ایک مستثنےٰ ہے جو قاعدہ کلیہ کو ثابت کرتا ہے۔ سودا و قائم کی نظمیں۔ انشا و جرأت کی مثنویاں مصحفی کی بحر المحبت۔ نواب محبت خاں کی اسرار محبت۔ میر تقی ہوس کی لیلےٰ مجنوں اسی دور کی تصنیفات ہیں اور اُن میں وہ سب نقائص موجود ہیں جن سے آج عبرت و عشرت کا کلام ہدفِ ملامت بنایا جا سکتا ہے عبرت کے نظم کردہ حصہ میں میر تقی علیہ الرحمہ کا سوز و گداز کسی قدر پایا جاتا ہے۔ البتہ عشرت کی نظم کا آخری حصہ خشک اور بے لطف ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نہایت بے توجہی اور بے دلی سے لکھا گیا، عشرت نے عجلت کو مدنظر رکھا ڈیڑھ مہینہ میں نظم تمام کی اور محاسن کلام کو نظر انداز کیا۔ بہرحال ان کی سعی مشکور سے مثنوی پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ قصہ کی رنگینی۔ خیالات کی بلند پروازی نے پھول کی جستجو میں کانٹوں کی زحمت ناگوار ہونے نہ دی۔ مثنوی کی دل آویز ابتدا نے مایوس کن انتہا کا کسی قدر معاوضہ کر دیا۔ سخن فہموں نے قدر و قیمت کی۔ عوام و خواص نے قبولیت کی سند دی۔ شعرا نے تحسین و آفرین کے خلعت پہنائے۔ مصحفی نے تذکرہ شعرا میں اس نظم کی داد دی اور فرانسیسی مستشرق گارسن ڈی ٹاسی نے اس مثنوی کی بہت تعریف لکھی۔ یہ دلچسپ مثنوی غدر سے نو سال پہلے ۱۲۶۵ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی اور اب کمیاب ہے۔ قدیم کتب خانوں میں اس کے نسخے موجود ہیں مگر بازار میں کوئی کاپی دستیاب نہیں ہو سکتی۔ نظم طویل ہے۔ تقریباً چار ہزار اشعار ہیں اور اس کے بعض مضامین مثل توصیف عمارات و باغات و تجمل برات وغیرہ زمانۂ حال میں دلکش نہیں لہٰذا ضرورت تھی کہ اس مثنوی کا ایک خلاصہ شایع کیا جائے جس میں عبرت و عشرت کی نظم کردہ داستان مسلسل و مکمل آ جائے مگر زوائد حذف کر دئے جائیں۔ جامع الاوراق نے خلاصہ کا ایک نمونہ مرتب کیا ہے۔

داستان مسلسل ہے۔ ترکیب و بندش و ترتیب میں کوئی تصرف نہیں حتی الامکان بہترین اشعار انتخاب میں آ گئے ہیں اور کتاب کا حجم نصف سے بھی کم ہو گیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ شاعرانہ حیثیت سے حذف کے قابل تھا لیکن داستان کی تکمیل کے لئے شامل رکھا گیا ہے اور نہایت ادب سے یہ انتخاب اہل دانش و بینش کی خدمت میں پیشکش ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

فقیر امیر احمد علوی

فنونِ ادبیہ اور حقیقت نگاری

اس میں شک نہیں کہ انسان، فطرت کا آخری اور مکمل ترین شاہکار ہے، لیکن اُس کا تدریجی ارتقا کتنا ہی پاکیزہ اور اُس کے کارنامے کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں، وہ اپنے آپ کو اُس ماحول سے کبھی علحدہ نہیں کرسکا جس میں اُس کا نشوونما ہوا ہے۔

زندگی کا قانون سمندر کے حیوانات بے استخواں سے لیکر ترقی یافتہ انسان تک تمام ذی روح اشیاء کو اپنے شکنجہ میں کسے ہوئے ہے اور جس طرح ایک پھاوڑہ چلانے والا وحشی اُس سے آزاد نہیں۔ اسی طرح ایک نازک دست نقاش پر بھی اس کی گرفت پوری طرح قایم ہے۔

عہد قدیم کا وحشی، زمین، سورج، سمندر، آسمان، پہاڑوں کی چوٹیوں، جنگلوں اور میدانوں کو دیکھتا تھا اور حیرت کرتا تھا، طوفان اور سیلاب کو دیکھتا تھا اور حیران رہجاتا تھا وہ بیماری اور موت کو دیکھتا تھا اور خوفزدہ ہوجاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں سوائے اس کے کچھ نہ آتا تھا کہ ان تمام مظاہر فطرت کو دیکھنے کے بعد سوائے حیرت کرنے اور ڈرنے کے ایک انسان اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ان کیفیات کی تشریح کے لئے خداؤں، اور اچھے برے دیوتاؤں کو پیدا کیا۔ جو وحش طیور کی صورت میں ہوا کرتے تھے یا خود ایک دیو پیکر انسان کی شکل میں، جب وہ دریاؤں کی طغیانی کو دیکھتا تھا تو سمجھتا تھا کہ وہ ایک غضبناک دیوتا ہے جو گنا ہگار دنیا کو تباہ و برباد کردینا چاہتا ہے۔ جب وہ طوفان برق و باد کو دیکھتا تھا تو یقین کرتا تھا کہ یہ دیوتاؤں کا غصہ ہے جو انسان پر نازل ہو رہا ہے اور آخرکار ان آفات سے بچنے اور برہم دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسان نے جانوروں اور بچوں کی قربانی دینا شروع کی۔ یہ تھے قدیم وحشی انسان کے، جذبات وخیالات جو پتھر یا لکڑی پر منقوش کئے گئے اور یہ تھا قدیم انسان کا قدیم لٹریچر اور اس کا وحشی آرٹ۔

جب دنیا نے اور ترقی کی تو دیوتاؤں کے علاوہ بادشاہوں اور دلیوں کی عظمت ظاہر کرنے کیلئے بھی اس آرٹ۔ سے کام لیا گیا ہے لیکن اس قدر مبالغہ کے ساتھ کہ واقفیت ہنوز پنہاں رہی۔ انھوں نے

اُس کو بادشاہوں کی توہین خیال کیا کہ ان کی تصویریں معمولی گوشت و پوست رکھنے والے انسانوں کی طرح طیار کی جائیں اور اُن کے افسانے ایسے لکھے جائیں جن میں شاہزادے، امراء و بیگمات، معمولی مردوں اور عورتوں کی طرح کام کرتے ہوئے نظر آئیں، چنانچہ انسان نے اپنے خیال کے مطابق فرضی داستانیں گھڑیں اور خداؤں اور فرشتوں کی تمام حیرت انگیز طاقتیں شاہی خاندان کے افراد میں منتقل کر دیں۔

عہدِ قدیم میں ادب، سنگتراشی، مصوری، موسیقی، اور فنِ تعمیر، بلکہ آرٹ کے تمام اصناف بڑے آدمیوں کی واحد ملکیت ہوا کرتے تھے اور اُس زمانہ کے مصوروں سے بھی (آج کل کے اکثر مصوروں کی طرح) یہی کام لیا جاتا تھا کہ وہ طاقتور کی طاقت قائم رکھنے اور کمزوروں میں احساس کمزوری باقی رہنے دینے کے لئے اپنے موقلم سے کام لیں۔ کسی شخص کے خواب میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایک معمولی انسان کی زندگی میں کوئی خوبی یا کوئی رومان پیدا ہو سکتا ہے۔

بہرحال دنیا کو جو کچھ آرٹ اور لٹریچر کے متعلق معلوم ہوا ہے وہ یکسر غیر حقیقی ہے۔ کیونکہ وہ نتیجہ ہیں صرف اُن پراگندہ دماغ اور واہمہ پرست لوگوں کی خیال آفرینیوں کا جنھوں نے صرف خداؤں، دیوں، فرشتوں اور شیطان کی نمایندگی کی۔ ولی بجائے خود ایک چیز ہے مگر اس کی تصویر کو اس طرح پیش کرنا کہ اس کے سر کے چاروں طرف نورانی حلقہ نظر آئے، صرف واہمہ کی پیداوار ہے اور آرٹ کی غیر حقیقی نمایندگی۔ فرشتوں کے وجود کو بھی مان لیجئے مگر ہاتھ رکھنے والے فرشتہ کے بجائے پردار فرشتہ کے کیا معنی۔ جب یہ مصور دیوں اور مریم کی تصویریں نہ کھینچتے تو اپنا وقت بادشاہوں کی تصویریں بنانے میں صرف کرتے جو عام مردوں اور عورتوں سے بالکل علٰحدہ ہوتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک آرٹسٹ اُس زمانہ میں کسی معمولی آدمی کی تصویر کھینچتا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ اس غریب کے پاس نہ اچھے کپڑے ہوتے تھے جو تصویر کے لئے موزوں ہوں اور نہ روپیہ جو آرٹسٹ کی محنت کا معاوضہ ہو سکے۔ الغرض عہدِ قدیم کا مصور ایک غریب کی خدمت کسی طرح نہیں کر سکتا تھا، جس طرح موجودہ عہد کا ایک وکیل کسی مفلس کی پیروی نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد لٹریچر کی ترقی کا ایک دور اور آیا جس میں خداؤں اور بادشاہوں کے علاوہ دوسری ہستیوں کی طرف اس کو توجہ ہوئی لیکن اس وقت بھی مصنفین کی اعجوبہ زائیاں بدستور قایم رہیں مثلاً دیو کی طاقت اور جادو کی تلوار رکھنے والے سورما، طلسم بند محلوں اور سونے کے ڈھیر رکھنے والے شاہزادے، ایسے مسافر جن کا خونخوار درندوں سے مقابلہ ہوتا اور وہ ان کو عجیب و غریب طریقوں سے مار ڈالا کرتے۔ کوہ پیکر دیو جو بجز بستہ قامتوں کے اور سب کو گرفتار کر سکتے تھے۔ اُس زمانہ میں ریل ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ مگر ایک قدم میں تین میل کی مسافت طے کرنے والے جوتوں نے سفر کو بہت آسان کر دیا تھا۔ غباروں اور ہوائی

کو لوگ نہیں جانتے تھے مگر ہیرو ستاروں اور آسمانوں کی رفعت سے نیچے زمین کی ہر ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا، ان کو رات کے وقت سونے سے قبل صرف ایک مٹر کا دانہ رکھنے کی ضرورت تھی جو صبح کو ایک طویل درخت بنکر آسمان تک پہونچ جاتا ہیرو، اگرچہ اوپر چڑھنے کا ماہر نہ ہوتا تھا مگر صرف ڈنڈے کو پکڑ کر اُس کا یہ کہنا "میں اوپر چڑھتا ہوں - میں اوپر چڑھتا ہوں" کافی ہوتا اور اس طرح وہ بادلوں میں غائب ہو جاتا تھا- ایک زمانہ تھا کہ اس قسم کے افسانے لوگوں کو خوش کرنے کا باعث ہوا کرتے تھے اور ان کے پڑھنے والے انہیں بالکل غلط نہیں سمجھتے تھے-

موجودہ زمانہ کا انسان اس قسم کے افسانوں کو پسند نہیں کرتا- ہر چند اُسے جھوٹ ضرور اچھا معلوم ہوتا ہے مگر صرف اس قدر کہ وہ یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ یہ سچ نہیں ہے اپنے آپ کو اس کا یقین دلا سکے کہ یہ جھوٹ بھی نہیں ہے لیکن دورِ حاضر کا ادبی ذوق یقیناً اتنا صحیح ہو چکا ہے کہ اب اُسے ایسے افسانوں کی ضرورت ہے جو کم از کم نصف سچ ہوں-

واقعیت صرف فطرت کی پرستار ہے، وہ یہ نہیں کہتی کہ ایسی کوئی جگہ ہی نہیں جہاں انسان سے زیادہ طاقت رکھنے والی ہستیاں پائی جاتی ہوں یا یہ کہ آنکھیں اُس سے زیادہ خوبصورت آفتاب کبھی دیکھ ہی نہیں سکتیں جس کا بادلوں اور سمندروں سے کبھی نکلنا ممکن ہے، لیکن ہاں واقعیت کو یہ ضرور معلوم ہو کہ بے شمار صدیوں کے بعد فطرت نے انسانی دماغ اور انسانی آنکھ کو آہستہ آہستہ اس زمین اور اس میں کی اشیاء کا خوگر بنا دیا ہے اور اسلئے اس دنیا میں انسانی آنکھ کا ایک دنیاوی منظر سے متاثر ہونا ضروری ہے-

یہ کہنا کہ "واقعیت" حقیر و ادنیٰ چیز ہے، گویا یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسان ان چیزوں کا بھی تصور کر سکتا ہے جو مصنوعات فطرت سے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہیں، اس میں شک نہیں کہ بت ساز کی آنکھ ان تمام خطوط کو دیکھ لیتی ہے جو ایک مکمل انسانی شکل تیار کر سکتے ہیں اور وہ سنگ مرمر کے ٹکڑے کی اس حد تک تراش خراش کرتا ہے کہ وہ اصل سے مشابہ ہو جائے، لیکن یہ اصل کیا ہے؟ وہی جس کا نمونہ سب سے پہلے فطرت نے طیار کیا تھا اور جس میں نقاش و مصور کوئی اضافہ نہیں کر سکتا-

مذہب نے سیکڑوں طویل اور تاریک صدیوں تک ہمیں یہی درس دیا کہ انسانی جسم ایک حقیر شے ہے جس میں انسانی روح مقید ہے چنانچہ اسی لئے وہ اپنے جسم کو بدنما و داغدار کر لیتے تھے اور ان پر کپڑے ڈال لیا کرتے تھے- جسم انسانی کے حسن کے متعلق مذہب نے سیکڑوں سال تک یہ تعلیم دی کہ وہ بری اور نفرت انگیز چیز ہے- اہل مذہب کی یہ عام تلقین تھی کہ جسم کی موت روح کی پیدائش ہے اور اس لئے مصور کا جسم میں زندگی پیدا کرنا روح کی موت ہے-

ہر چند یہ قدیم مذہبی تعصب انسان کے دماغوں سے آہستہ آہستہ محو ہو چکا ہے مگر اُس کے آثار ابھی تک پائے جاتے ہیں۔ یعنی ہر چند اب یہ کہنے کے لئے کوئی بھی طیار نہ ہوگا کہ تمام جسم ناپاک ہے مگر پھر بھی عام رواج اور وراثتی عقیدہ کی وجہ سے ہم کو یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ اُس کا کچھ حصہ پاک اور کچھ ناپاک ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا کسی خاص حصۂ جسم کو چھپانا کسی فطری جذبۂ حیا کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ جس چیز کو ہم حیا کہتے ہیں وہ ہمارے رواج پوشش سے پیدا ہوئی ہے۔ اگر ہم اپنے دماغ سے وہ سب کچھ محو کر دیں جو وراثت اور ماحول کا عطیہ ہے تو بھی ہمارے لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہو جائے گا کہ کتنا پھر بھی باقی رہنا چاہیے کیونکہ رسم و رواج نے اکثر چیزوں کو اچھا بنا دیا ہے اور اکثر چیزوں کو بُرا۔ اسی لئے حقیقت دریافت کرنے کے لیے ہم کو فطرت کی طرف متوجہ ہونا چاہئیے۔

حقیقی مصور اس نظریہ کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ انسانی جسم میں کوئی خط ایسا کھینچا جا سکتا ہے جو پاک اور ناپاک کو علحدہ کر دے۔ بعض پرستاران حقیقت ایسے بھی ہیں جو ایک چیز کے حسن اور اس کے نقائص کو دیکھتے ہیں اور اس فرسودہ سوال کا جواب دینے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس کی پشت پر کوئی قادر مطلق قوت ہے یا نہیں۔ بلکہ وہ صرف اس نازک رشتہ کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کی انفرادی زندگی کو اس چیز سے ہم آہنگ بناتا ہے جس سے ان کو محبت ہے اور وہ بجز اس کے کچھ نہیں جانتے کہ زندگی کا ہر حصہ اچھا ہے۔

ایک سچا مصور، کسی انسانی شکل یا ڈھانچے میں تمام خوبصورتی نہیں دیکھ لیتا۔ وہ غروب آفتاب کی طرف دیکھتا ہے جو بادلوں کو گلابی بنا دیتا ہے اور اس کی سب سے بڑی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اسی طرح کا منظر پیش کر سکے اُسے یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسے غروب آفتاب کی تصویر کھینچ سکتا ہے جو تاریک ہو جانے والی دنیا کو روشنی پہونچانے والے سورج سے زیادہ بہتر ہو۔ وہ خاموش جھیلیں، سبزہ زار میں، اور بہنے والے چشموں میں خوبصورتی دیکھتا ہے۔ وہ آبشار اور پہاڑ کی چوٹی میں ایک عظمت دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ان چشموں اور پہاڑ کی چوٹیوں سے (جنھیں فطرت نے بنایا ہے) زیادہ مکمل اور کوئی چشمہ یا پہاڑ کی چوٹی نہیں بنا سکتا۔

آرٹ کی ترقی کی طرح ادب کی ترقی بھی فرضی داستانوں سے فطرت دحقیقت کی طرف ہوئی ہے۔ از منۂ قدیم کے افسانے عام انسانوں اور عام مناظر سے متعلق نہیں ہوتے تھے۔ ایک ادیب کسی غلام کی عظمت نہیں دکھا سکتا تھا یا کسی غریب آدمی کا افسانہ نہیں بیان کر سکتا تھا۔ اُسے دنیا کے نظام موجودہ کی تائید میں اور بادشاہ کی مسرت کے لئے جو اُسے روزی دیتا تھا لکھنا ضروری تھا چنانچہ وہ بادشاہوں، ملکاؤں، سورماؤں عورتوں، جنگ اور فتوحات کے بارے میں لکھتا اور جو رنگ وہ استعمال کرتا وہ انسانی خون ہوتا تھا۔

دُنیا ان پرانے قصوں، جنگ و خون کے مناظر اور روح کو تھرا دینے والے افسانوں کی عادی ہو چکی ہے

اُس نے ان افسانوں کو اتنے عرصہ تک پڑھا کہ اب وہ ایک معمولی چیز اور کتاب کے لئے غیر موزوں معلوم ہوتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ ایک افسانہ ہم کو اسوقت تک پسند نہیں آسکتا جب تک ہم اس کو کسی حد تک صحیح نہ تصور کریں۔ افسانہ کے افراد اور ان کی زندگیوں سے ہمیں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور ہم کو انکی کامیابی یا ناکامیابی کا خیال آنے لگتا ہے۔ اس لئے اس جذبہ سے بے نیاز ہو کر کوئی افسانہ نگار کامیاب نہیں ہو سکتا۔

بازیچۂ حیات میں ہر ایکٹر اپنی نگاہ میں اپنے آپ کو بہت اہم تصور کرتا ہے۔ جس دنیا سے وہ واقف ہے وہی اس کے گرد گردش کرتی رہتی ہے اور، اُس کے نزدیک دنیا نام ہے صرف ان حالات کا جن کے ماتحت وہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ باہر کی متلاطم دنیا کو بالکل بھول جاتا ہے اور اسے یہ کبھی خیال نہیں ہوتا کہ اس وسیع دنیا میں وہ کتنی کم جگہ پُر کئے ہوئے ہی وہ مرجاتا ہے، اس کے چند غمخوار دوست چند دن تک اظہار افسوس کرتے رہتے ہیں اور پھر دنیا کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کبھی تھا بھی یا نہیں۔ روز زندگی میں تقریباً ہر واقعہ معمولی ہوتا ہے مگر بعض دنوں میں کچھ خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، کام کرتے ہیں، سوتے ہیں اور کبھی کبھی ہم کو دفعتاً ایک مسرت عظیم حاصل ہوتی ہے یا غیر معمولی صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن ایسے واقعے اولاً تو بہت کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے بھی ہیں تو ان کا تعلق صرف ہماری ذات سے ہوتا ہے، ساری دنیا کو اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ پُرانے ناولوں میں فطری مناسبت و توازن کا لحاظ نہیں ہوتا تھا اور ہیرو ہیروئن کی اہمیت اتنی زبردست ہوتی تھی کہ تمام دنیا خاموشی سے اُس وقت تک دیکھتی رہتی تھی، جب تک محبت کرنے والوں کے دل اور ہاتھ نہ ملجاتے تھے۔ وسیع سمندر، وحشتناک جنگل، منجمد سمندر جب قسمت کے لکھے کے سامنے مجبور ہوتے تھے اور جب محبت تمام ناممکنات پر فتح پالیتی تھی تو قصہ ختم ہو جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ حقیقی زندگی میں محبت کے کارنامے بہت عظیم الشان ہیں اور بعض اوقات محبت کے نام پر بڑی بڑی خدمتیں انجام دی گئی ہیں، بڑی بڑی قربانیاں کی گئی ہیں لیکن زندگی کے دوسرے واقعات بھی کم دلچسپ نہیں ہیں۔

بہ سلسلۂ واقعہ نگاری ایسے افسانوں کے خلاف جن میں خواہشات انسانی کا ذکر ہوتا ہے احتجاج کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ان خواہشات سے انکار کرتا ہے وہ انسانی زندگی سے انکار کرتا ہے جو لوگ ایسے افسانوں کی مذمت کرتے ہیں وہی ان عشقیہ قصوں کی حمایت کرتے ہیں جو عورت اور سوسائٹی دونوں کے لئے بہت زیادہ مضر ہیں۔

اس نوع کے قدیم عشقیہ افسانے ایک لڑکی کو یہ بتاتے تھے کہ کسی وقت وہ بھیس بدلے ہوئے شہزادہ سے ملیگی جس کو وہ اپنا نقد دل دے بیٹھے گی چنانچہ وہ سڑکوں پر ایسے شہزادہ کو ڈھونڈھنے نکلتی اور جتنا زیادہ وہ

بھیس بدلے ہوئے ہوتا اتنا ہی زیادہ اُسے یہ یقین ہوتا کہ یہی وہ شہزادہ ہے مگر ایک حقیقت نگار، خواہشات اور محبت کی اُسی طرح مصوری کرتا ہے جیسی وہ دراصل ہیں۔ مرد اور عورت دونوں اپنی خوبصورتی، اپنے ڈر، اپنی صحیح پوزیشن کا احساس کرتے ہیں اور کسی ایسی گمراہی میں مبتلا نہیں ہوتے جس کا تعلق صرف تادیلات کی دنیا سے ہے۔

دنیا اب مبلغین مذہب اور ان کے مواعظ سے تنگ آ چکی ہے اور اب اُسے حقایق کی ضرورت ہے وہ پریوں اور فرشتوں کے تذکرہ سے گھبرا چکی ہے اور اب وہ گوشت پوست کے انسانوں کی بابت دریافت کرنا چاہتی ہے۔ وہ زندگی کے حسن کو بھی دیکھنا چاہتی ہے اور اُس کے عیب کو بھی، وہ صرف شہزادیوں اور گرور ہتیوں کو ہی نہیں بلکہ مزدوروں، فقیروں، آقا اور غلام کو بھی دیکھنا چاہتی ہے۔

اعلیٰ انسانی ہستیاں حقایق زندگی سے پیدا ہوئی ہیں۔ ایک فلاسفر نہایت صحیح منطق کے ساتھ بحث کر سکتا ہے اور ہم کو دکھا سکتا ہے کہ دنیا کہاں پر غلطی کرتی ہے۔ اقتصادیات کا ایک ماہر ہمیں دولت اور غربت کی بابت جو ساتھ ساتھ چلتی ہیں بتا سکتا ہے مگر یہ سب نظریات ہیں۔ ڈکنس (Dickens) نے ایک مرتبہ کسی بڑے شہر میں ایک غریب خاکروب کو اپنی جھاڑو سے سڑک صاف کرتے دیکھا۔ اُس کے چاروں طرف عالیشان ایوان تھے، نفیس گاڑیاں تھیں، خوبصورت لباس تھے لیکن ان سیکڑوں مکانوں اور محلوں میں اس غریب خاکروب کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اُس کا گھر سڑک ہی تھی اور جب کبھی وہ ایک منٹ کے لئے رک جاتا تو پولیس کا آدمی برہم ہوتا اور حکم دیتا کہ "آگے بڑھو" آخرکار اس "آگے بڑھو" سے مضمحل و پریشان ہو کر وہ ایک عالیشان عمارت کے زینہ پر بیٹھ گیا جو "انجیل مقدس کی تبلیغ" کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔ جب ہم اُس بدنصیب اور پریشان حال خاکروب کا اس عیش و عشرت کے ہنگامہ میں خیال کرتے ہیں، تو ہمیں دنیا کے اور ہزاروں لاوارث بچوں کا تصور پیدا ہوتا ہے اور ہم اس دنیا کی نام نہاد تہذیب کو برا سمجھنے لگتے ہیں۔ ایک حقیقت شناس دولت و اقتدار کی پرستش کبھی نہیں کر سکتا اور نہ وہ دولت کی خاطر اپنے جذبات کی قربانی کر سکتا ہے۔

پرانے زمانے کے آرٹسٹ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ ولیوں، فرشتوں اور دیوتاؤں کے فرضی افسانوں سے انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ جنگ کی تصویریں اس طرح کھینچتے تھے کہ سپاہیوں کی لانبی لانبی قطاریں وردی پہنے کھڑی ہیں اور ہر سپاہی خوش خوش نظر آرہا ہے۔ جنگ کا منظر ہمیشہ فتحمند کیمپ کا دکھایا جاتا تھا جس میں علم جنگ اپنے شوخ رنگوں کے ساتھ دشمن کے قلعہ پر لہراتا ہوتا تھا۔ گویا جنگ ایسی دلچسپ چیز ہے کہ ہر شخص کو اس کی خواہش کرنا چاہئے۔

برخلاف اس کے ورشگین Vereschagin بھی جنگ کی تصویر کھینچتا ہے لیکن

اس طرح کہ اس سے نفرت پیدا ہونے لگے - ایک ڈراؤنا منظر، جہاں انسان کو رانہ جوش سے مغلوب بندوقوں اور توپوں کی آواز اور بہتے ہوئے خون سے پاگل ہو کر دوسرے کو مفلوج، مجروح اور قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ میدان جنگ کا اس طرح نقشہ کھینچتا ہے گویا وہ قتل و غارت کا میدان ہے جہاں انسان اپنے خون کی پیاس بجھانے کے لئے درندوں سے بازی لیجانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ دشمن کون ہے جس سے جنگ کی جاتی ہے؟ وہ بھی انھیں کی طرح انسان ہے جو ایک دوسرے بادشاہ کے فرمان پر اندھا دھند اپنی جان دینے چلا آیا ہے۔ وہ ایسے غلام ہیں جن کے پاس کوئی زمین تک نہیں اور نہ جن کی جانبازی کا کوئی صلہ۔ اختتام جنگ کے بعد کا منظر دیکھئے: ہر چہار طرف لڑائی کی تباہکاریاں ہیں، میدان پر ہر سمت خاموشی طاری ہے اور صحرائی جانوروں کا تسلط ہے۔ ایک نوجوان سپاہی زمین پر پڑا ہوا ہے، چاروں طرف برف گر رہی ہے ہر چہار سمت پہاڑوں کی سنسان چوٹیاں ہیں اور ہر جگہ جنگ کی غارتگری نظر آ رہی ہے سپاہی کی وردی خراب ہو چکی ہے، اُس میں دھبے پڑ گئے ہیں اور اس کے سینہ پر ایک سرخ نشان دکھائی پڑتا ہے جو سخت منجمد اور سرد ہے ...... یہ اُس کی زندگی کا خون ہے جو قلب میں تیر کی نوک گھس جانے کی وجہ سے بہ نکلا تھا۔ اُس کا جسم سخت اور ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ جب وہ بچہ تھا تو عظمت و اقتدار کے خواب دیکھا کرتا تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ اس کی ساحرانہ طاقت کے سامنے یہ عظیم الشان دنیا اطاعت قبول کرنے کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ جنگ و جدل، فتحمندی اور شہرت کے خواب دیکھا کرتا تھا اور یہ سوچا تھا کہ اگر وہ مرے گا تو اُس کے دوست اُس کی قبر کی پرستش کریں گے۔ لیکن اب کوئی انسانی آنکھ اس کے دیکھنے کی بھی روادار نہیں اور جب برفباری کے بعد گرمی کا زمانہ آئے گا تو کوئی شخص اُس کی ہڈیوں کو بھی نہ پا سکے گا۔ اس جنگ کے منظر میں آثار زندگی اگر پائے جاتے ہیں تو صرف ایک گدھ کی وجہ سے جو ہوا میں چکر لگا رہا ہے اور صرف اس بات کا یقین کرنے کے لئے چکر لگا رہا ہے کہ آیا یہ شخص واقعی مر چکا ہے یا نہیں، یہ گدھ نوجوان کی آنکھوں کی طرف دیکھتا ہے ــ وہ آنکھیں جن سے وہ کبھی خود اس عظیم الشان دنیا کو دیکھا کرتا تھا اور جن پر کبھی اُس کی ماں نہایت اشتیاق سے بوسہ دیا کرتی تھی۔ انھیں آنکھوں کو وہ گدھ اب اپنی غذا بنائے گا! ــ حقیقت یہ ہے کہ نہ تمام دنیا خوبصورت ہے اور نہ تمام زندگی اچھی ہے۔ ایک سچے مصور کو اس کا استحقاق نہیں کہ وہ صرف خوبصورت مقام ہی کا انتخاب کرے اور ہم کو یہ یقین دلائے کہ دنیا اسی کا نام ہے۔ اُسے جس طرح صداقت سے محبت ہے اسی طرح اُسے جھوٹ اور بُرائی کو بھی پیش کرنا چاہئے۔ جس طرح وہ بھی مساوات کو پسند کرتا ہے اُسی طرح اُسے آقا اور غلام کی تصویر بھی کھینچنا چاہئے۔ اُسے سچ کہنا چاہئے، سب کچھ سچ ہی بتانا چاہئے حتیٰ کہ ایک بہرہ سننے لگے اور غبی سے غبی دماغ بھی اُس پر غور و فکر کرنے لگے۔

آگ اور خون سے کھیلنے والا ایک انسان

آگ — آگ — آگ — !!

یہی ایک کلمہ تھا جو ہزاروں خشک زبانوں پر جاری تھا اور روما کے گوشہ گوشہ میں گونج رہا تھا، لوگوں کے گلوں میں کانٹے پڑ گئے تھے، لب ہلانے کی بھی طاقت انہیں باقی نہ تھی، لیکن اب بھی ایک خشک "چیخ" کی صورت میں جو آواز پیدا ہوتی تھی وہ یہی تھی کہ — آگ — آگ !!

کامل تین گھنٹے آتش زدگی کو ہو چکے تھے لوگوں کے ہنگامہ و اضطراب، شور و شیون، کا یہ عالم تھا، گویا کرۂ زمین کا دل دھڑک رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت باہر نکل پڑے۔

آگ نے شہر کے تمام مکانوں اور معبدوں کو اندر باہر چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور دھوئیں کے بادلوں سے جو لال لال شعلے بلند ہو ہو کر نمودار ہو رہے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں اور "رگِ سنگ" کا ہر ہر شرارہ لہو میں تبدیل ہو گیا ہے۔

مکانوں کی چھتیں عجیب و غریب دھماکے کی آواز سے گر رہی تھیں جس کے ساتھ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی چیخیں مل کر ایسا ہیبتناک منظر پیش کر رہی تھی کہ اُسے سوائے خدا کے اور کوئی صبر و سکون کے ساتھ دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ شہر کے معابد اور وہاں کا قیمتی سامان، ہیکلوں کی قربانگاہیں اور وہاں کے مقدس ہدایا سب آگ کی نذر ہو چکے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آسمان و زمین کے سب سے بڑے دیوتا کے سامنے آج سب سے بڑی قربانی پیش کی جا رہی ہے۔

ٹھیک یہی وقت تھا کہ نیرون — روما کا شاہنشاہ اعظم — قصر کے اندر سے مسکراتا ہوا، اٹکھیلیاں کرتا ہوا برآمد ہوا۔ سیکڑوں خدام مشعلیں لئے ہوئے اس کے آگے آگے تھے اور امراء دربار زرق برق لباسوں کے ساتھ اس کے جلو میں — اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی اور رخساروں میں خوشی کی لہک، لبوں پر اطمینان و سکون کا تبسم تھا اور رفتار میں عجیب و غریب "اندازِ گلگشت" — اس کے ہاتھ میں اس کا محبوب سرود تھا جس کے تاروں پر اس کی انگلیاں اس طرح چل رہی تھیں گویا اس سے

بہتر فرصتِ نغمہ اس کو کبھی مل ہی نہیں سکتی۔ شعلوں کی لپٹیں گویا اس کے لئے بادِ نسیم کے جھونکے تھے جو اسے مست کئے ہوئے تھے اور مخلوق کی چیخ پکار گویا نغمۂ الوہیت تھی جس کے ساتھ سرود کے تاروں کو چھیڑنے میں وہ سماوی سکون محسوس کرتا تھا۔

—— یہ واقعہ ۶۴ء کا ہے جبکہ روما پر حکمرانی کرتے ہوئے نیرو آن کا گیارھواں سال گزر رہا تھا۔

جب آگ کا دیوتا اپنی تدریں لیکر رخصت ہو گیا اور سارا شہر خاکستر کا ڈھیر نظر آنے لگا تو نیرو آن بھی اپنے قصر کو واپس آیا اور ہاتھ سے سرود رکھ کر مسند پر بیٹھ گیا جس کے سرخ اطلس کو فنیقیا کی خوبصورت لڑکیوں کے خوبصورت ہاتھوں نے بُنا تھا۔

نیرو آن نے امرار دربار سے مخاطب ہو کر کہا کہ۔ آج میں نے شہر روما کو خاک سیاہ کر کے واقعاتِ عالم میں ایک ایسے واقعہ کا اضافہ کیا ہے جس کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور جو تاریخ کے صفحات پر جلی سُرخ حروف سے لکھا جائے گا، لیکن اسی کے ساتھ میں روما کی خاک پر ایک اور دوسرا شہر بناؤں گا جس کے عظمت و جمال کے سامنے تم قدیم شہر کو بھول جاؤ گے۔

نیرو آن کی شخصیت کو تاریخ نے جس طرح پیش کیا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے اور جہاں کہیں اس کا نام آتا ہے "آتشزنِ روما" کی صفت بھی ضرور استعمال کی جاتی ہے دنیا میں بڑے بڑے ہیبت و جبروت والے بادشاہ گزرے ہیں، ظلم و ستم سے کھیلنے والی بڑی بڑی ہستیاں گزر چکی ہیں، لیکن آگ اور خون کی جتنی پیاس نیرو آن کو تھی اتنی کسی کو نہ تھی۔

نیرو آن کی شخصیت صرف اپنی سنگدلی اور شقاوت و بیرحمی ہی کے لئے مشہور نہ تھی بلکہ مجموعۂ اضداد ہونے کی حیثیت سے بھی دنیا نے اسے حیرت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیرو آن مجموعہ تھا بہت سے ایسے آدمیوں کا جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد طبیعت رکھتے تھے اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ خود اسے کیا سمجھا جائے۔

وہ حد درجہ سنگ دل تھا اور اتنا ہی رحیم المزاج، وہ بے انتہا غضبناک شخص تھا اور اتنا ہی محبت کرنے والا، وہ ایک مصلح تھا خرابات پسند، وہ ایک شاعر تھا دشمنِ شعر و شاعری، وہ ایک موسیقار تھا عدوے نغمہ و موسیقی ۔۔ الغرض یہ کچھ تھا نیرو آن جو روما کو آگ لگا کر سرود بجانے میں مصروف تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی لطف و کرم سے کام نہیں لیا، مگر صرف ایکبار لیکن اپنے لطف کا کتنا بڑا معاوضہ وہ پہلے ہی وصول کر چکا تھا اس کا حال ذیل کے واقعہ سے معلوم ہو گا۔

نیرون اپنے تخت پر جلوہ افروز ہے اور امراء چاروں طرف بیٹھے ہوئے ہیں، غلامانِ زریں کمر سیکڑوں کی تعداد میں تعمیل احکام کے لئے سر جھکائے ہوئے کھڑے ہیں اور فرطِ ہیبت سے قصر میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ دفعتہً اس کی شیر کی سی آواز بلند ہوتی ہے اور حکم دیتا ہے کہ شراب حاضر کی جائے۔

خدام میں ایک شخص یونانی الاصل بھی تھا جو اپنے آقا کے وطن ایتھنس سے بھاگ کر یہاں آگیا تھا اور جسے نیرون نے آبدار خانہ کا داروغہ بنا دیا تھا اس کا نام دیوموس تھا۔

نیرون نے غلاموں سے کہا کہ "حاضرین کو خوب جام بھر بھر کر شرابیں پلاؤ کیونکہ آج کا دن میری انتہائی مسرت کا دن ہے اور آگ کے خوبصورت منظر سے جو سکر پیدا ہوا ہے اُسے اس قدر جلد ختم نہ ہونا چاہئے"

پیا پیے جام بھر بھر دئے جانے لگے، لوگوں نے خالی کرنا شروع کئے اور نشہ کی سرخیاں حاضرین کے چہروں پر دوڑ گئیں۔ لیکن دیوموس اس وقت موجود نہ تھا اور باہر آبدار خانہ کے انتظام میں مصروف تھا۔ نیرون کو دفعتاً خیال آیا اور اس نے پوچھا کہ "دیوموس آج یہاں نظر نہیں آتا، کہاں ہے"، جواب ملا کہ "باہر انتظام میں مصروف ہے"

یہ سنتے ہی نیرون کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور باڈی گارڈ کے افسر سے جو دروازہ پر کھڑا ہوا تھا مخاطب ہو کر کہا کہ۔ "کیا میں نے دیوموس کو حکم نہیں دیا تھا کہ وہ دعوتوں میں مجھے ہمیشہ اپنے ہی ہاتھ سے شراب پلائے۔ پھر وہ کیوں نہیں آیا۔ جاؤ اس ملعون یونانی کو ابھی پکڑ کر حاضر کرو"۔

دیوموس کانپتا ہوا سامنے آیا اور قدموں پر گر کر معافی چاہی کہ "میں نے عمداً یہ خطا نہیں کی ہے بلکہ باہر کے انتظام میں اتنا مصروف تھا کہ حاضری کا خیال دل سے نکل گیا۔

لیکن نیرون، جس نے آج تک کبھی کسی کا عذر نہیں سنا تھا اس کا عذر کیوں سنتا۔ اس نے عصائے شاہی اٹھایا اور اس زور سے اس کے سر پر مارا کہ خون کا فوارہ سر سے جاری ہو گیا اور وہ بیہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔۔ نیرون نے حکم دیا کہ ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کو ایک طرف ڈال دیا جائے۔ جب دعوت ختم ہونے کا وقت قریب آیا اور ہر شخص کے دماغ پر شراب پوری طرح مسلط ہو گئی تو نیرون نے حکم دیا کہ۔۔۔ "دیوموس کو سامنے لایا جائے" اور پھر جلاد کو بلا کر حکم دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ لے، چنانچہ جلاد نے اس کے دونوں ہاتھ تلوار کی ایک ضرب سے جدا کر دئے، اس حال میں کہ نیرون اور تمام امراء اس کی تکلیف اور تڑپ کو دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔

—— "کیا تمھیں بہت تکلیف ہے"

—— "ہاں، یہ اذیت ناقابل برداشت ہے اور اسی لئے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم چھری لیکر میرا کام تمام

کردو تاکہ اس عذاب سے مجھے نجات مل جائے۔

—— "لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ہم غلام سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور میرا فرض ہے کہ جس طرح ممکن ہو تمھیں زندہ رہنے دوں اور تمھاری خدمت کروں"

جس وقت دیوموس کے ہاتھ کاٹے گئے تو اس نے اپنے ساتھی ایک افریقی غلام سے کہا کہ تم مجھے ہلاک کر ڈالو کیونکہ اس زندگی سے موت بہتر ہے، لیکن اس نے اس پر عمل نہیں کیا بلکہ قصر کے ایک گوشہ میں لیجاکر اسکی خدمت و تیمارداری شروع کی یہاں تک کہ اس کے زخم اچھے ہوگئے اور رفتہ رفتہ تمام وہ کام جو ہاتھ سے کیا کرتا تھا، پاؤں کی مدد سے انجام دینے لگا۔۔۔ نیرون کا معمول تھا کہ کبھی کبھی وہ خود قصر کے مختلف حصوں میں جاکر دیکھا کرتا تھا کہ کون کیا کر رہا ہے، چنانچہ ایک دن اتفاق سے اس کا گزر وہاں بھی ہوا جہاں دیوموس پاؤں سے برتن صاف کر رہا تھا، نیرون اس کے سامنے کھڑا ہوگیا اور حیرت سے دیکھنے لگا کہ یہ کون ہے جو پاؤں سے ہاتھ کا کام لے رہا ہے۔ وہ بالکل بھول گیا تھا کہ دیوموس یہی ہے جس کے ہاتھ اس نے کسی وقت قطع کرائے تھے۔

نیرون نے محل واپس جاکے داروغہ کو بلایا اور پوچھا کہ یہ کون تھا جو پاؤں سے برتن صاف کر رہا تھا"۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ "اے آقا، یہ آپ ہی کا دیرینہ غلام دیوموس یونانی ہے، جس کے ہاتھ کاٹے جانے کا آپنے حکم دیا تھا۔ موت اس کی قسمت میں نہ لکھی تھی اس لئے بچ گیا اور بدستور اپنے آقا کی خدمت میں مصروف ہے"

نیرون یہ سنکر بہت متاثر ہوا (اسکی زندگی کا یہ بالکل پہلا اور آخری تاثر تھا) اور حکم دیا کہ دیوموس کو حاضر کیا جائے۔ دیوموس سامنے آیا تو نیرون نے اس سے مخاطب ہوکر کہا کہ "اے میرے بھائی اس میں شک نہیں کہ میں نے تمھارے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا لیکن امید ہے کہ اب تم معاف کردوگے"۔ نیرون کی زندگی کا یہ بالکل پہلا واقعہ تھا کہ اس نے کسی سے معافی چاہی ہو۔ دیوموس اس کے قدموں پر گر پڑا اور بولا کہ "اے آقا، آپ میری جان کے مالک تھے اور ہیں، آپ نے جو کچھ کیا وہ بھی حق بجانب تھا اور اب جو آپ کرینگے وہ بھی بالکل درست ہوگا"

نیرون نے کہا کہ "آج میں تمھیں آزاد کرتا ہوں اور اپنے قصر کا محافظ مقرر کرتا ہوں"

یہ کہکر اس نے دیوموس کو رخصت کر دیا اور متعدد غلام اس کی خدمت کے لئے مامور ہوگئے۔

اس کے بعد دس سال تک دیوموس اور زندہ رہا اور پاؤں سے کام کرنے کی ایسی مشق بہم پہونچائی کہ نقاشی و بت تراشی میں بھی اس نے خاص شہرت حاصل کی۔ چنانچہ اس نے نیرون کا بھی ایک مجسمہ طیار کیا جو نیرون کی خوابگاہ میں ہر وقت رکھا رہتا تھا۔ جب ۶۸ء میں نیرون کا انتقال ہوا تو یہ مجسمہ بھی توڑ دیا گیا لیکن دیوموس بدستور اپنی خدمت پر مامور رہا کیونکہ سارا روما اس کے کمال نقاشی کا معترف تھا۔

نہ اب نیرون باقی ہے، نہ دیوموس لیکن ایک کے ظلم و ستم اور دوسرے کے صبر و تحمل کی داستان ہنوز زندہ ہے۔ ممکن ہے نیرون کی روح اب بھی اس بات پر نازاں ہو کہ اسی کی وجہ سے روما کو اتنا بڑا صاحب کمال نقاش میسر ہوا۔

زندہ قوموں کی داستانِ زندگی

نباتات و حیوانات کی زندگی کا انحصار صرف اس قوت پر ہے جو فضا سے حاصل ہوتی ہے اور جس کا سب سے بڑا ماخذ آفتاب ہے۔ کرۂ زمین سے انسان کو جتنی قوتیں حاصل ہوتی ہیں خواہ وہ کوئلہ کی صورت میں ہوں یا پٹرول کی شکل میں، آبشاروں سے حاصل کی جاتی ہوں یا ہوا سے، سب آفتاب ہی کا صدقہ ہیں۔

آپ خشکی میں ہوائی چکیوں کو اور پانی میں بادبانی جہازوں اور کشتیوں کو چلتا ہوا دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہوا کی مدد سے ہو رہا ہے، لیکن ہوا کیا ہے؟ وہ ایک تلاطم ہے گیس کے سمندر کا جو آفتاب کے درجۂ حرارت کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔

آپ کوئلہ کو مشتعل کرتے ہیں اور اس سے قوت حاصل کر کے مشینوں کو حرکت دیتے ہیں۔ لیکن کوئلہ کیا ہے؟ وہ نتیجہ ہے آفتاب کی حرارت کا جو درختوں میں لاکھوں سال تک ایک کیمیائی قوت پہونچاتی رہتی ہے اور پھر ان کو زیر زمین دفن کر کے کوئلہ کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جس کو آپ پٹرول کہتے ہیں وہ بھی حرارت آفتاب ہی کے کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے۔

• اسوقت تک میکانکی طاقت حاصل کرنے کے سب سے بڑے ذریعے یہی دو ہیں۔ کوئلہ اور پٹرول، لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کی ذہنی ترقی کا ساتھ دینے کے لئے یہ دونوں ذریعے کب تک کام دیں گے۔ یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا جب کوئلہ کی معدنیں ختم ہو جائیں گی، پٹرول کے چشمے خشک ہو جائیں گے اور انسان کی بنائی ہوئی تمام مشینیں یک لخت ٹھہر کر رہ جائیں گی۔

ماہرین کی تحقیق و جستجو یہ ہے کہ زمین کی تمام معدنوں میں کوئلہ کی مقدار دو ہزار بلین ٹن ہے اور فی الحال سالانہ خرچ ایک بلین ٹن کا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا خرچ ہر سال برابر بڑھ رہا ہے اس لئے اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک ہزار سال کے اندر معدنوں کا تمام کوئلہ ختم ہو جائے گا اور یہ زمانہ انسان کے مستقبل کے لحاظ سے بہت کم ہے۔

اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ یہ اندازہ صرف اس صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ کرۂ ارض کے تمام معدنوں کا کوئلہ حاصل کر لیا جائے، لیکن چونکہ بعض فنی دماغی دشواریوں کی وجہ سے اس کا امکان نہیں ہے۔

اس لئے ہزار سال سے قبل ہی کوئلہ کا قحط پڑ جانا لازم ہے۔

یہی وہ خطرہ تھا جس پر غور کرنے کے لئے برطانیہ کے مشہور کیمیا داں سر ولیم رمزے نے ۱۹۱۰ء میں بڑے بڑے ماہرین فن کی ایک کمیٹی ترتیب دی اور فکر ہونے لگی کہ علاوہ کوئلہ اور پٹرول کے وہ اور کونسے ذرائع ہیں جن سے ہم مشین چلانے والی قوتیں پیدا کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سمندر کے مد و جزر کی طرف خیال گیا، زمین کی اندرونی حرارت پر غور کیا گیا، ہوا اور آبشار کی قوت پر فکر کی گئی، زمین کی حرکت محوری اور آفتاب کے چاروں طرف اس کی گردش پر نگاہ کی گئی بلکہ اس قوت پر بھی غور کیا گیا جو جواہر مادی کو باہم مربوط رکھتی ہے۔

آخر کار کافی بحث و گفتگو کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر چند زمین کی اندرونی حرارت اور اس کی گردش محوری سے بھی قوت حاصل کی جا سکتی ہے اور ذرات مادہ میں جو قوت پنہاں ہے اس کا تو جواب ہی نہیں ہو سکتا، لیکن چونکہ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بڑا زمانہ درکار ہے اس لئے فی الحال پانی اور مد و جزر سے قوت حاصل کرنا مناسب ہوگا۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ اسوقت تمام پانی سے جتنی قوت حاصل کی جاتی ہے وہ ۷ کرور ٹن کوئلہ جلانے کے بعد میسر آسکتی ہے گویا دنیا میں اس وقت جتنی قوت سے کام لیا جا رہا ہے، یہ اس کی چوتھائی کے برابر ہے اگر دنیا کے تمام آبشاروں سے خواہ وہ قدرتی ہوں یا مصنوعی کام لیا جا سکے تو اس سے کہیں زیادہ قوت حاصل ہو سکتی ہے لیکن غالباً اس کا امکان نہیں ہے۔ مد و جزر سے قوت پیدا کرنے کی طرف انیسویں صدی سے اسوقت تک لوگ متوجہ ہیں اور حال ہی میں ایک طریقہ اس قوت کے حصول کا نکالا بھی گیا ہے لیکن اس کا عملی دائرہ صرف فرانس، انگلستان اور جرمنی کے اندر محدود ہے اور اس کی عام اشاعت اس لئے متعذر ہے کہ مصارف بہت آتے ہیں۔

سمندر سے قوت حاصل کرنے کا بھی ایک جدید طریقہ دریافت کیا گیا ہے اور اس کا انحصار اس نظریہ پر ہے کہ ان حصوں میں جو خط استوا کے نیچے واقع ہیں سطح بحر کی حرارت اس کی اندرونی حرارت سے بہت مختلف ہوا کرتی ہے اور اس اختلاف سے جو بخار پیدا ہوتا ہے اس کے دباؤ سے کہربائی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔

آفتاب سے جو قوت خط استوا کے نیچے واقع ہونے والے حصص زمین کو پہونچتی رہتی ہے اس کا اندازہ فی گھنٹہ ہر مربع مٹر پر ۱۸۰ کالوری کیا گیا ہے یعنی اگر یہ قوت برابر آٹھ گھنٹے پہونچتی رہے تو فی مربع میل اتنی قوت حاصل ہو سکتی ہے جو ۴۰۰۰ ٹن کوئلہ جلانے کے بعد میسر آتی۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ کرۂ ارض کے ریگستانوں پر (جنکی پیمائش ۳۰۰۰۰۰۰۰ مربع میل ہے) آفتاب کی جتنی قوت بیکار جاتی ہے وہ تمام دنیا کی زغال[1] قوت سے ۱۸۰۰ گنا زائد ہے۔

[1] زغال کوئلہ کو کہتے ہیں

چنانچہ اب ماہرین کے سامنے یہ اہم مسئلہ پیش ہے کہ آفتاب کی اتنی زبردست قوت کو کیونکر ضایع ہونے سے بچایا جائے۔ اس کے لئے ایک طریقہ تو یہ سوچا گیا ہے کہ آئینوں اور محدب شیشوں کے ذریعہ سے حرارت آفتاب کو جذب کرکے کسی ایک ظرف میں محدود کیا جائے اور یہاں سے اسے ایک معدنی مخزن میں پہونچایا جائے جہاں اس سے بخار یا اسٹیم پیدا کی جائے، چنانچہ امریکہ میں اس کا تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک گھنٹہ تک اس طرح حرارت آفتاب حاصل کرنے کے بعد ۲۲۵ پونڈ کا دباؤ ایک مکعب انچ پر ڈال سکتے ہیں۔ لیکن اس طریق سے صرف ان ممالک میں کام لیا جا سکتا ہے جو خط استوا کے نیچے واقع ہیں، غیر استوائی مقامات میں جہاں آفتاب زیادہ تر گرد و غبار یا بادلوں میں چھپا رہتا ہے وہاں اس کا امکان نہیں ہے۔ علاوہ اس کے ایک اعتراض اس طریق پر یہ بھی کیا جاتا ہے کہ کسی وسیع حصۂ زمین پر پڑنے والی تمام شعاعوں کو ہم ایک مرکز پر نہیں لا سکتے کیونکہ اسوقت تک جس پیمایش کے محدب شیشے طیار ہو سکے ہیں وہ شعاعوں کے پھیلاؤ کے لحاظ سے بہت چھوٹے ہیں۔۔۔ تیسرا طریقہ آفتاب کی شعاعوں سے فایدہ اٹھانے کا وہی ہے جو خود قدرت نے اختیار کیا ہے۔ یعنی نباتاتی خلایا جس طرح ہوا، مٹی اور پانی وغیرہ سے کاربن حاصل کرکے لکڑی اور اس کے بعد کوئلہ طیار کرنے کا باعث ہوتے ہیں بلکہ اسی اصول پر ہم بھی حرارت آفتاب سے کوئلہ طیار کریں۔ ڈاکٹر براؤن کا تجربہ ہے کہ سو مربع گز قطعۂ زمین صرف دو گھنٹے کے اندر نور آفتاب کی مدد سے اتنا ایندھن طیار ہو سکتا ہے جو ۱۵ پونڈ کوئلہ کی قوت کے برابر ہو۔۔۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ نور آفتاب سے براہ راست برقی قوت حاصل کی جائے چنانچہ بعض کیمیائی اشیاء کی مدد سے اس میں بھی ایک حد تک کامیابی حاصل کی گئی ہے۔

الغرض اسوقت دنیا کے سامنے سب سے بڑا سوال حصول قوت کا ہے اور اس کے لئے وہ آسمان و زمین کی ہر ہر چیز کو ٹٹول رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ یہ جستجو کس مرکز پر جا کر ٹھہرے گی۔ لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ عالم کے اندر تگ و دو کا یہ اضطراب برپا ہے اور ہر مہذب و تعلیم یافتہ قوم حصول قوت و استعلاء کے لئے صحرا کے ایک ایک ذرہ کو الٹ کر رکھ دینے پر تلی ہوئی ہے۔ ایک قوم ایسی بھی ہے جو اب تک سو رہی ہے اور سوتے رہنے پر صرف اس لئے مصر ہے کہ اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو حور و قصور، کوثر و سلسبیل کے نظارے آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ یہ بدنصیب قوم مسلمانانِ ہند کی ہے جن کی سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ مذہب انسان کے لئے پیدا کیا گیا تھا نہ کہ انسان مذہب کے لئے۔ وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں صرف اس لئے کہ مذہب زندہ رہے اس لئے اب کہ دنیا سے مذہب رفتہ رفتہ ختم رہا ہے ان کا ختم ہو جانا بھی یقینی ہے اور مادر زمین کے لئے وہ وقت انتہائی مسرت کا ہوگا جب وہ اپنی گردن کو لعنت کے اس طوق سے آزاد دیکھے گی۔

باٹا و باٹا نگر

دُنیا میں آج وہ کون شخص ہو جو باٹا کے نام سے واقف نہیں، لیکن بہت کم لوگ اس سے آگاہ ہونگے کہ اس کی صنعت کی ترقی کا کیا راز ہے باٹا کا انتقال ہو چکا ہے اور عمر طبیعی تک پہونچنے سے قبل ہی ۔ لیکن وہ تھوڑے ہی زمانہ میں اپنے کاروبار کو اتنا مضبوط کر گیا ہے کہ اسکی موت وزیست کا کوئی سوال ہی اس سلسلہ میں پیدا نہیں ہوتا۔

جوتا بنانے والے کارخانے ہزاروں لاکھوں دنیا میں قائم ہوئے اور ہونگے لیکن جتنی شہرت باٹا کو حاصل ہوئی وہ آج تک کسی کو نصیب نہ ہوسکی اور نہ اتنے وسیع پیمانہ تک اس کاروبار کو کوئی پھیلا سکا۔

جس وقت کسی کارخانہ کا نام لیا جاتا ہے تو ہم ذہن کی انتہائی وسعت سے کام لیکر زیادہ سے زیادہ یہ خیال قائم کرتے ہیں کہ وہ کوئی بہت بڑی عمارت ہوگی اور سیکڑوں مزدور اس میں کام کرتے ہونگے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ باٹا کا کارخانہ نہ نام ہے کسی ایک عمارت کا نہ ایک دو یا چند عمارتوں کا، بلکہ وہ عبارت ہے ایک ایسے شہر سے جس میں تیس ہزار سے زیادہ انسان بستے ہیں اور جن کا کام سوائے جوتا طیار کرنے کے اور کچھ نہیں ہے اچھا تو آیئے مختصر الفاظ میں اس شہر اور یہاں کے بسنے والوں کا بھی حال سُن لیجئے نیز یہ کہ باٹا کی ترقی کا راز کیا تھا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسوقت دنیا کے تمام کارخانوں میں سرمایہ دار اور مزدور کا تعلق صرف اسقدر ہے کہ ایک محنت کرتا ہے اور دوسرا اس کی اُجرت ادا کرتا ہے اور اس کے علاوہ ان دونوں میں کوئی اور تعلق نہیں ہوتا۔ اگر سرمایہ دار اپنی کسی تجارتی اُپچ (SPECULATION) کی وجہ سے تباہ ہو تو مزدوروں کو پرواہ نہیں ہوتی اور اگر مزدوروں کی جماعت کسی وجہ سے پریشان حال ہو تو سرمایہ دار کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن سب سے پہلی چیز جس کی طرف باٹا نے توجہ کی اسی مغایرت و بے تعلقی کو دور کرنا تھا، کیونکہ یہ باہمی مغایرت نہ صرف یہ کہ اُصول انسانیت کے خلاف ہے بلکہ اکثر کارخانوں کے زوال کا باعث بھی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے کام کا یہ اُصول قرار دیا کہ کارخانہ کے تمام کام کرنے والے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے ایک دوسرے کے ساتھ مل جلکر رہیں گے اور سوسائٹی میں ان کو بالکل مساوات حاصل ہوگی۔

دوسرے یہ کہ ہر کام کرنے والا علاوہ اپنی اُجرت کے نفع میں بھی شریک ہوگا، یعنی وہ صرف مزدور نہ ہوگا بلکہ کمپنی کا حصہ دار بھی ہوگا۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ عدم مساوات کی وجہ سے جو منافرت اونچے اور نیچے درجے کے کام کرنے والوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور کام کی خرابی کا باعث ہوا کرتی ہے، دور ہوگئی اور دوسرے یہ کہ ہر شخص انتہائی جدوجہد اور پورے ولولۂ عمل کے ساتھ کام کرنے میں مصروف ہوگیا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کمپنی ہی کے فائدہ میں اس کا فائدہ بھی مضمر ہے۔ یہ تھا اصل راز باٹا کی کامیابی کا، جس نے اسے دنیا میں اتنا مشہور کر دیا۔ اب اسی کے ساتھ یہ بھی سنئے کہ مزدوروں کے ساتھ اس کا سلوک کیا تھا؟

سب سے بڑی چیز جس نے وہاں کے مزدوروں میں عزم و نشاط کی روح پیدا کی، تحریک مساوات ہے، جس نے تمام مزدوروں کو ایک رشتۂ اتحاد سے وابستہ کر دیا ہے اور ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو ایک ہی خاندان یا قبیلہ کا فرد سمجھتا ہے۔ نہ ان کے لباس میں کوئی فرق ہے نہ مکان میں، نہ غذا میں عدم مساوات ہے نہ طریق معاشرت میں۔ جس طرح وہاں کا بڑے سے بڑا منیجر زندگی بسر کرتا ہے اسی طرح وہ ادنیٰ مزدور جس کا کام صرف جوتوں میں کیل ٹھونکنا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ باٹا نے اور ذرائع بھی اس روح عمل کے قیام کے لئے اختیار کئے جن کا تعلق اُصول صحت و معاشرت سے ہے۔ چنانچہ اس وقت باٹا نگر کی زاید از بست ہزار آبادی میں تمدن جدید کی وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شہر میں ہو سکتی ہیں وہاں نہایت پاک و صاف ہوٹل ہیں، نفیس حمام ہیں، پاکیزہ تفرجگاہیں ہیں، سینما ہیں، تھیٹر ہیں، ورزشگاہیں ہیں، جھیلیں ہیں، کشتیاں ہیں، مدرسے ہیں، تادیب گاہیں ہیں جہاں وہ، ان کی عورتیں اور ان کے بچے بالکل فردوسی زندگی بسر کرتے ہیں۔

باٹا نگر کا قانون بھی ایک خاص ہے جو باٹا نے وضع کیا ہے اور اس کی پابندی ہر شخص کرتا ہے۔ چنانچہ وہاں کوئی شخص اس وقت تک نکاح نہیں کر سکتا، جب تک اس کی آمدنی وہاں کے مروجہ قانون کے مطابق نہ پائی جائے۔ اسی کے ساتھ ہر ہر مزدور کی آمدنی کا بجٹ طیار کیا جاتا ہے اور اس کو ہدایتیں کیجاتی ہیں کہ وہ اپنی آمدنی میں کیونکر اضافہ کر سکتا ہے اور روپیہ کا بہترین مصرف کیا ہے۔

یہاں ہفتہ میں صرف پانچ دن کام ہوتا ہے۔ اور جمعہ کی شام سے پیر کی صبح تک پورے دو دن اور تین راتیں سیر و تفریح میں بسر ہوتی ہیں اس فرصت میں کچھ لوگ پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں، کچھ فٹ بال وغیرہ میں مصروف ہو جاتے ہیں، بعض سائکلوں پر سوار ہو کر دور نکل جاتے ہیں اور بعض قہوہ خانوں کی زندگی سے لطف اُٹھاتے ہیں جہاں سوائے شراب کے ہر چیز کھانے پینے کی میسر آسکتی ہے۔ شراب اور شراب کی قسم کی کوئی چیز اس آبادی کے اندر نہیں پائی جا سکتی۔

مزدوروں کے لئے جو ہوٹل یہاں طیار کئے گئے ہیں وہ بالکل جدید طرز کے ہیں، اور حفظانِ صحت کے نہایت ہی مکمل اُصول پر قائم ہیں۔ حتےٰ کہ برتنوں کو صرف بھاپ سے صاف کیا جاتا ہے اور کوئی شخص انہیں ہاتھ نہیں لگاتا۔ ان ہوٹلوں کی وسعت و خوبی اہتمام کا یہ عالم ہے کہ دس منٹ کے اندر چار ہزار آدمیوں کے سامنے کھانا آجاتا ہے۔ بچوں کے ناشتہ کے لئے جن کو کوئی ثقیل غذا نہیں دیجا سکتی، توس اور صاف دودھ فراہم کیا جاتا ہے جس کی قیمت ایک آنہ سے زیادہ نہیں ہوتی اور دوپہر کا کھانا ایک جوان آدمی کا پانچ چھ آنے میں ملجاتا ہے۔

یہاں کی تماشہ گاہوں اور سرود خانوں میں صرف وہی چیزیں پیش کی جاسکتی ہیں، جو انسان کے جذبۂ عمل کو ابھارنے والی ہیں۔ سینما کا ٹکٹ دو آنے سے زیادہ نہیں ہے اور یہاں صرف وہی فلم دکھائے جاسکتے ہیں جو معلومات میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ عشقیہ فلم یا ایسے فلم جن میں جرائم وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے یہاں داخل ہی نہیں ہوسکتے۔

یہاں ایک وسیع حدیقۂ حیوانات بھی ہے جہاں لوگ جاکر وحوش و طیور کی طبیعی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں متعدد شفاخانے بھی ہیں، جہاں جدید ترین آلات و ذرایع سے لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

باٹا نے اخلاقی حالت کی طرف بھی کافی توجہ کی، چنانچہ وہاں رات کو مقررہ وقت کے بعد کوئی لڑکی یا عورت گھر سے باہر نہیں نکل سکتی اور اگر کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کرے تو اسے سزا دیجاتی ہے۔

عبادت کے لئے یہاں گرجا بھی ہیں اور جلسوں کے لئے لکچر ہال بھی، جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں اور تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ یہاں کے بازاروں میں عمال کی تمام ضروریات پائی جاتی ہیں اور مقررہ ارزاں قیمت پر فراہم کی جاتی ہیں۔

باٹا کے کارخانوں میں نہ صرف جوتا بلکہ وہ تمام چیزیں طیار کی جاتی ہیں جن کا تعلق اس صنعت سے ہے۔ دباغت کے کارخانہ میں چونکہ بُو زیادہ ہوتی ہے اس لئے ایک خاص قسم کے نقاب طیار کئے گئے ہیں جن سے چہرہ چھپا لیا جاتا ہے اور شامہ بدبو سے محفوظ رہتا ہے۔ یہاں ایک مطبع بھی ہے جس سے ہفتہ میں تین بار باٹا گزٹ شایع ہوتا ہے اور تمام ممالک کی سیاسی و تجارتی خبریں عمال تک پہونچاتا ہے۔

خود باٹا کی محنت کا یہ عالم تھا کہ وہ ۱۴ گھنٹے مسلسل روزانہ کام کرتا تھا اور تھکنا نہ جانتا تھا ——— ہندوستان میں بھی ایک دو نفوس اس عزم و ارادہ کے ہوئے ہیں جن کا حال ہم آیندہ اشاعت میں بیان کریں گے۔

ریڈیو سننے والے

(لاسلکی نشرگاہ دہلی سے ۲۹ مئی سنہ ۳۶ء کو نشر کیا گیا)

خدا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سنتا سب کی ہے کرتا اپنی جیسی ہے۔ ریڈیو سننے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ سنتے سب کی ہیں اور کر کچھ نہیں پاتے، غالب کو بھی یہی دقت پیش آئی تھی لیکن وہ تو یہ کہکر صاف نکل گئے۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

لیکن آپ کو تو معلوم ہے جب آدمی کچھ کر نہیں پاتا تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے یا اس کے بندوں کو گالی دینے لگتا ہے مگر اب زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے کہ آدمی کو اللہ کا شکر ادا کرنے کی نہ تو فرصت ہے اور نہ ضرورت، چار ناچار گالی سے جی بہلاتا ہے۔ اس میں ریڈیو والوں کا کوئی قصور نہیں ہے ان کی کمزوری ضرور ہے۔ وہ ہر ایک کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض لوگ خوش ہونے سے شرماتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ خوش ہونے سے کھانا کم ہضم ہوتا ہے۔ ریڈیو سننے والے بھی اکثر قابل رحم ہوتے ہیں۔ اول تو یہی کیا کم آفت ہے کہ ان کی کوئی نہ سنے اور وہ سب کی سنتے جائیں۔ اس لئے اکتا کر اگر وہ کبھی کبھی اول فول بکنے لگیں یا بکنے لگ جائیں، (بکنے لگیں یا بکنے لگ جائیں دونوں صحیح ہیں۔ بشرطیکہ آپ پہلے یہ دریافت کرلیں کہ بکنے والا کون ہے) یا چہرہ ایسا بنائیں جیسے کوئی اناڑی کی طرح سوڈا واٹر چڑھا جائے اور ڈکار آنے والی ہو تو مہذب بننے کی کوشش کرے تو ان کو معاف کر دینا چاہئے۔

ریڈیو سٹ ابھی ہندوستان میں عام تو ہوا نہیں ہے اس لئے جس کسی کے پاس اس قسم کا سٹ ہے اس کو وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جیسے کسی گاؤں میں پہلے پہل اونٹ آیا لوگوں نے کہا بھگوان آئے۔

آپ معاف فرمائیں اونٹ اور بھگوان والی مثل کا میں مصنف نہیں ہوں۔ یہ روایت صرف بزرگوں سے سنتا آیا ہوں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں میں نے نہ تو اونٹ قسم کا بھگوان دیکھا نہ بھگوان قسم کا اونٹ البتہ ان اقسام کے آدمی ضرور دیکھے ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ ہی کے آس پاس کوئی صاحب اسی قسم کے بیٹھے ہوں۔ لیکن آپ گھبرائیں نہیں وہ جس کل بیٹھ گئے ہوں گے بیٹھے ہوں گے۔ پھر اونٹ کی صحبت کچھ بری بھی نہیں ہے بشرطیکہ آپ اس وقت کسی اونٹ گاڑی کی اوپر والی منزل پر نہ بیٹھے ہوں۔ معاف کیجئے گا ریڈیو سننے والوں

کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔ میں نے احتیاطاً اونٹ گاڑی کا نام لے دیا ورنہ کجا آپ اور کجا اونٹ۔ پورب کی مثل تو آپ نے سنی ہوگی دودھیلی گائے کی دولات بھی برداشت کرنا چاہئے۔ اور اونٹ کا حال تو آپ جانتے ہیں، اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی نتیجہ یہ نکلا کہ اونٹ اور گائے دونوں الہامی جانور ہیں جن سے ذرا دور ہی رہنا بہتر ہے۔

اچھا دیکھئے وہ صاحب جو سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ ان کی آنکھ دیکھئے دونوں مصنوعی ہیں کہنے کا مطلب یہ کہ بٹن جیسی یعنی پتھرائی ہوئی۔ یہ گانا جانتے نہیں، لیکن ان سے زیادہ گانا سمجھنے کی کوشش کرنے والا شخص میں نے نہیں دیکھا ہے۔ گانا سنتے وقت ان کا پیٹ پھولنے لگتا ہے اور شکل چوروں جیسی ہوجاتی ہے پوچھا جاتا ہے حضور گانا کیسا تھا عموماً اکر جواب دیتے ہیں گانا کون سن رہا تھا، پوچھا گیا حضرت کس فکر میں تھے بولے کنجی کہیں بھول آیا۔ تلاش میں نکلا، پھر سوچا ریڈیو ہی سنتے چلیں اور کیوں جی یہ جو گا رہا تھا کوئی عورت تھی یا مرد، میں نے کہا نہ عورت نہ مرد، گراموفون تھا۔ کہنے لگے جب ہی تو سوچتا تھا کہ آواز کبھی کی سنی ہوئی ہے لاحول ولاقوۃ۔

ریڈیو سننے والوں کو ایک جگہ بیٹھا دیکھ کر مجھے اکثر کونسل یا اسمبلی کا اجلاس یاد آجاتا ہے یعنی پروگرام جاری ہے لیکن حاضرین اپنے اپنے حال میں مست ہیں کوئی ہنس رہا ہے کوئی بول رہا ہے کسی کو بولنا نہیں آتا تو کڑھ رہا ہے کوئی اونگھ رہا ہے کوئی کسی ایسے مقام کی تلاش میں ہے جہاں نہ اس کو کوئی دیکھ سکے اور نہ اُس کی سُن سکے کوئی آمادہ فوجداری ہے تو کوئی آمادۂ وفاداری۔

میرا تجربہ تو یہ ہے کہ بعض لوگ ریڈیو کے بہانے شربت پانی سگریٹ سے شغل کرنے آتے ہیں اور چلتے وقت یہ کہکر دل بڑھا جاتے ہیں کہ آپ کا ریڈیو اچھا ہے فرصت ہوئی تو کبھی پھر سنوں گا، اچھا پروگرام ہوا کرے تو اطلاع بھجوا دیا کیجئے۔ ریڈیو کے بعض مالک خود ریڈیو نہیں سنتے بلکہ ریڈیو سننے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور اُن کو اُس نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے اللہ تعالیٰ اپنے کمزور بندوں کی دوڑ دھوپ، مکروفریب، رنج وراحت دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں دیکھئے کیسی معمولی چیز کو یہ شخص کس انہماک یا دلچسپی سے سُن رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی کیسا کارساز ہے۔ اپنے کمزور بندوں کی حاجت روائی مجھ سے کراتا ہے، اچھا خوب لطف اُٹھائیے قبل اس کے کہ تو اس دُنیا سے اُٹھ جائے نادان کھلونے کھیلنے والا جانور!

بعض سننے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر مجھے بے اختیار محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص بیوی سے لڑکر آیا ہے۔ ورنہ یہاں سے جاکر ضرور لڑے گا۔ ایسے اشخاص ریڈیو کا سارا پروگرام سن جائیں گے لیکن کانوں کے ذریعہ نہیں نتھنوں کے راستے۔ وہ بھی اس طور پر گویا براڈکاسٹنگ اسٹیشن والوں کو چیلنج دے رہے ہیں۔ بس! میرا

تم نے کیا بگاڑلیا۔ ہاتھی جھومتا جائے کتا بھونکتا جائے حالانکہ آپ یقین مانئے اس میں اور ہاتھی میں سواسونڈ کے اور کوئی چیز ملتی جلتی نہیں پائی جائے گی۔

میرے ایک دوست ریڈیو اس طور پر سنتے ہیں جیسے کوئی مذہبی شخص ہو جس کا گناہ کرنے کا جی چاہتا ہو لیکن گناہ کرنے کی نہ اہلیت ہو نہ ہمت۔ ان کا جی تو بہت چاہتا ہے کہ ریڈیو سنیں لیکن ڈرتے اس سے ہیں کہ کوئی ریڈیو سنتے دیکھ لے تو اللہ میاں سے نہ کہہ دے۔ یا کوئی مولوی کافر نہ قرار دیدے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کو کافر بننے میں عذر نہیں ہے۔ البتہ ایک کافر ہے جو توقعات خوش مذاق لوگ کرتے ہیں وہ ان کے بس کی نہیں اس لئے کفر سے ڈرتے ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ سننے والے میاں بیوی ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ دو چار بچے بھی موجود ہوں۔ فرض کیجئے کوئی محترمہ گا رہی ہیں۔ میاں کو غور سے سنتے دیکھ کر بیوی کے کان کھڑے ہوئے بولیں کیسا برا گا رہی ہے، میاں بولے ہاں لیکن آواز سے کم سن معلوم ہوتی ہے۔ بیوی چمک کر بولیں دلی نہیں چلے جاتے میاں نے کہا تھوڑا اور سن لیں تو رائے قائم کریں اتنے میں کسی خاموش بچے کو دیکھ کر بولیں، باہر جا کر کھیلتا کیوں نہیں۔ یہاں پڑا کیوں سڑ رہا ہے۔ اس نے بھی کہدیا بھوک لگی ہے، ماں بولیں، باپ گانا سنیں، بیٹے کھانا ٹھوسیں اور میں ساری مصیبتیں جھیلوں۔ یہ ریڈیو جب تک جہنم رسید نہ ہوگا۔ اس گھر میں چین آرام دیکھنے نہیں ملے گا۔ اس اثنا میں کسی منچلے چھوٹے بچے نے لپک کر ریڈیو سٹ کی کوئی گھنڈی گھما دی۔ ریڈیو کا سانس تلے اوپر ہونے لگا۔ بیوی بچے پر جھپٹیں، بچے نے باوا کی پناہ پکڑی، باوا ریڈیو کی حفاظت کے لئے بڑھے۔ آخر میں مطلع صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ باوا کی عینک بیوی کی زلف میں جھول رہی ہے اور بیوی کا بندا باوا کی داڑھی سے پینگیں بڑھا رہا ہے بچوں نے تالیاں بجائیں اناونسر نے پکارا فلاں صاحبہ عورتوں کے حقوق پر گفتگو فرمائیں گی۔ بات آئی گئی ہوئی۔

ایک دن بازار سے گزر رہا تھا، ایک دوکان کی بالائی منزل پر ریڈیو سٹ تانیں اڑا رہا تھا۔ نیچے مجمع تھا، کچھ لوگ تانیں سیکھنے کی مشق کر رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں کھانس رہی تھیں اور کلجگ کو کوس رہی تھیں، فقیر بھیک مانگ رہے تھے، بچے گولی کھیلتے تھے، بوڑھے مرد قیامت کے منتظر تھے، نوجوانوں پر قیامت گزر رہی تھی۔ یہ سب کھیل ریڈیو کا تھا۔ ناگاہ ایک طرف گلی سے کوئی بے فکرا نکلا صرف لنگوٹی بندھی ہوئی، ہانگ نکلی ہوئی۔ منہ سے طبلہ بجاتے ہوئے۔ ایک یکہ بان کو دیکھ کر نعرہ لگایا، بیٹا گھوڑا بیچو نہیں جوانی مفلسی ہی میں کٹ جائے گی۔ بوڑھے کو دیکھ کر بولے، بابا کمر سیدھی کرنے کھڑے ہوگئے، گنگا اشنان ہو بال کالے ہو جائیں گے، بڑھیوں کو دیکھ کر کہنے لگے مائی جی سلام تم بھی کس سمے نکل پڑیں ابھی مائی جی پورے طور پر گالیاں بھی ختم کرنے پائی تھیں کہ ہمارے دوست نے ایک نوجوان عورت کو مخاطب کرکے تان لگائی آؤ آؤ نگریا ہماری۔ ایک بچے نے پکارا کلن دوست آؤ آج ہمارے ساتھ گولی کھیلو کتنے دنوں سے تم نہیں کھیلے اتنے میں سارے لڑکے کلن کو چمٹ گئے، کسی نے کہا گولی کھیلو، کسی نے کہا کندھے پر

بٹھاؤ کلن نے ایک کو کندھے پر بٹھا لیا دوسرے کو کیے پر بٹھا دیا، تیسرے کو اٹھا کر ایک موٹے تازے بنئے کی گردن سے چپکا دیا، چوتھے کی دونوں ٹانگیں مضبوط تھام کر سر سے بلند کیا اور مرغے کی آواز بلند کی، سامنے سے پولیس کا سپاہی آتا نظر آیا، مسٹر کلن نے ایک لڑکے کو دوکان کے سامنے کے ٹین کے چھجے پر پھینکا، چھجا نیچے آرہا، اسٹیل ٹرنک کی دوکان تھی سارے ٹرنک ایک دوسرے پر گرے، بھگدڑ مچ گئی، ریڈیو سننے والے ہنستے، بولتے، روتے، گالی دیتے، کھانستے، پھلانگیں مارتے یا لنگڑاتے اپنے اپنے راستے لگے اور مسٹر کلن یہ جا وہ جا غائب!

ریڈیو سننے والوں میں سب سے دلچسپ جماعت بچوں کی ہوتی ہے۔ میرا سابقہ ایسے بچوں سے ہے جو گانا یا تقریر سمجھنے کے بجائے ان کی نقلیں کیا کرتے ہیں۔ ایک ہی گھر میں ہر بچے نے ریڈیو سیٹ لگا رکھا ہے، جوتے کے خالی کاغذی بکس میں ایک چوڑا گول سوراخ بنا کر سرخ کاغذ لگا دیا ہے۔ یہ اصلی ریڈیو کے اس حصے کا جانشین ہے جو گھڑی نما سامنے ہوتا ہے۔ نقلی ریڈیو کو کمربند کے ذریعہ کھونٹی پر لٹکا کر ایریل کا کام لیا گیا۔ اب ریڈیو کے مالک کھڑے ہو کر پکارتے ہیں، دلی براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے شیخ نیازی ستار بجائیں گے۔ اب شیخ صاحب منہ سے ستار بجا رہے ہیں۔ دوسرے نے پکارا دلی براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے سلمی نعت سنائیں گے، نعت بھی شروع ہوگئی، صغرا دلی براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے بچوں کی تعلیم پر تقریر کریں گی۔ تقریر بھی شروع ہوگئی، اقبال نے آواز دی دلی براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے اقبال انگریزی خبریں سنائیں گے، خبریں بھی آنی شروع ہوگئیں احسان نے نعرہ لگایا۔ دلی براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے احسان بھجن سنائیں گے، بھجن بھی شروع ہوگئے، اتنے میں ایک صاحب کا جو ابھی پرچی تول رہے تھے، ریڈیو نمبر بر آرہا، انھوں نے چیخ چیخ کر بغیر پروگرام بتائے انگلش میوزک اور ہندوستانی پکا گانا ساتھ ساتھ شروع کردیا، پورے کمرے میں R.A.S. آرکسٹرا بج رہا تھا کہ دفعتاً مریخ براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے آواز آئی، قہرن اب خربزے تقسیم کریں گی۔ اس خبر نے آرکسٹرے کو آناً فاناً درہم برہم کردیا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو کسی کا ریڈیو کمربند کے ساتھ چلا آرہا ہے، کسی کا پاجامہ ہاتھ میں ہے اور کمربند کھونٹی پر، کسی کی نعت نتھنوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اور کسی کی بھجن گلے میں اٹکی ہوئی ہے۔ کسی کا ہاتھ خربزے پر اور کسی کی گردن قہرن کے ہاتھ میں!

سننے والے ہر قسم کے ہوتے ہیں امیر، غریب، مرد، عورت، جاہل، تعلیم یافتہ، معقول، نامعقول، تندرست، مریض، فلسفی، چور۔ غرض کہاں تک تفصیل بتائی جائے، سنانے والے بھی اتنی قسم کے ہوتے ہوں گے قطع کلام ہوتا ہے میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ممکن ہے سنانے والوں میں بعض اقسام نہ ہوتی ہوں گی۔ مثلاً چور یا کوئی اور، لیکن آپ اس کی ذمہ داری کیسے لے سکتے ہیں کہ کب وہ سنانا ختم کردیں گے اور چوری نہ شروع کردیں گے بالفرض چوری نہ بھی شروع کریں، تو قیافے سے چور معلوم ہوتے ہوں گے یہ بھی نہ سہی تو میری ہی غلطی سہی۔

غلطی انسانوں ہی سے ہوتی ہے خواہ وہ چوری ہی کیوں نہ ہو۔

پکے گانے سُنکر بعض لوگوں کو وحشت ہونے لگتی ہے لیکن جو اصحاب گانے کے فن سے واقف ہیں ان کو میں نے دیکھا ہے اس قسم کے گانے سے بے حد لطف اُٹھاتے ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں جن کو میں نے دنیا اور دنیا داروں سے بہت کم مطمئن اور خوش پایا ہے لیکن جب سے ریڈیو شروع ہوا ہے ان کی ذہنی زندگی بالکل بدل سی گئی ہے۔ ایک دن کسی قدر بشاش ہوکر فرمایا، دنیا ابھی رہنے کے لائق ہے۔ ہندوستان میں اچھے گانے بجانے والے اب بھی موجود ہیں۔ میں نے کہا اس قسم کا گانا بجانا ہوا کرے تو فدوی کو بھی یاد فرمالیا کیجئے چنانچہ ایک دن مجھے انھوں نے ایک صاحب کا گانا سنایا میں نے کہا حضرت یہ گانا ہے یا ہسٹریا، بگڑ کر بولے جہنم میں جاؤ، چھوکریوں کی چیں چیں اور ریں ریں سنا کرو تمہاری کئی پشت گانا نہیں سمجھ سکے گی۔ بہرحال میں نے ان کو اس گانے پر اونگھنے دیا اور خود بھاگ کھڑا ہوا لیکن اب اس امر کا بھی لحاظ رکھیں کہ میرے ان دوست کی عمر چالیس سال سے زائد نہیں ہے اور بیوی سے ڈرتے ہیں۔

ریڈیو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ہر شخص کے دوستوں اور عزیزوں کے دائرہ کو وسیع کر دیا ہے۔ کم سے کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ مقررہ وقت پر ریڈیو نے ہماری توجہ ہر طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مائل کر لی، اناؤنسر کی آواز خاندان کے کسی دوست کی آواز کی طرح کانوں میں آئی طبیعت خوش ہو گئی لیکن ظاہر ہے یہ تعلق اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اناؤنسر بار بار نہ بدلے جائیں۔ زمانہ گزرنے کے بعد اناؤنسر کی وہی حیثیت ہو جائے گی جو گھر کے ڈاکٹر یا ڈاکیے کی ہوتی ہے جس کی آواز پر گھر کا ہر چھوٹا بڑا دوڑتا ہے اس سے ایک قسم کی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت براڈکاسٹنگ اسٹیشن کے بعض بات چیت کرنے والوں کے ساتھ پیدا ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ ایسی بات چیت کریں جس سے لوگوں کا دل بہلے، بات چیت سے مراد گھریلو قسم کی بات چیت سے ہے مثلاً بچوں کی باتیں، کچھ ہنڈیا ڈوئی ــــ کچھ ہنسی ٹھٹھول۔ رشتے ناتے، آمدنی خرچ، مہمانوں کا آنا جانا، تیج تیوہار رسم کا حال، سیر و تفریح کے ذرائع اور وسائل، میٹھی میٹھی ہمدردی یا دل بہلانے کی باتیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی مستقل آدمی ایسا ہو جو براڈکاسٹنگ کا نہیں بلکہ صحیح معنوں میں سننے والوں کا آدمی ہو یعنی اسکو وہی حیثیت حاصل ہو جو اپنے گاؤں میں رپ وان ونکل کو حاصل تھی یعنی عورت، مرد، بچے سب کے دوست ہیں۔ اور سب کے معتمد۔ اپنے کام کے علاوہ سب کا کام کرتے ہوں، موسم وقت، عمر رنج راحت کسی کی قید نہیں۔

رشید احمد صدیقی

بین الاقوامی مزدور پارٹی کی تاریخ

اس میں شک نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام، اقطاعی دور (Feudalage) سے زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے اور انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس عہد میں انسان نے جتنی ترقی کی ہے، اتنی اور کسی عہد میں نہیں کی۔ یہی وہ عہد ہے جس میں ریل، تار، بجلی اور مشینری کی ایجاد ہوئی، اور عہد عتیق کا وعدۂ فردا، حال میں تبدیل ہوگیا۔ یہی وہ عہد ہے جب تجارتی مسابقت اس صورت سے دنیا کے سامنے آئی کہ امن و سکون ایک مسئلہ لاینحل ہوکر رہ گیا، اور ذاتی ملکیت و سرمایہ داری سے عام بیزاری پیدا ہوگئی اور یہی وہ عہد ہے جبکہ ایک طرف سوسائٹی کے چند افراد دنیا کو فردوس بریں بنائے ہوئے ہیں اور اکثر افراد پریشانی و اضطراب میں مبتلا ہیں۔ اور یہی وہ احساس تھا جس نے محنت کش جماعت کو سرمایہ داری کے خلاف باقاعدہ احتجاج شروع کرنے پر مجبور کیا۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آج تک انسان کو مختلف ادوار سے گزرنا پڑا ہے اور ہر آئندہ دور اپنے ماسبق دور سے زیادہ ترقی یافتہ ہوا ہے۔ ایک زمانہ اس انسان پر ایسا بھی گزر چکا ہے جب وہ جنگلوں میں خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتا تھا اور صرف شکار پر اس کی حیات منحصر تھی، اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے ترقی کی یہاں تک کہ اقطاعی دور شروع ہوا یعنی انسان انفرادی اقتدار حاصل کرنے کی طرف مائل ہوا اور سوسائٹی دو مختلف الخیال جماعتوں یعنی کسانوں اور زمینداروں میں منقسم ہوکر رہ گئی۔ اسکے بعد انسان کی ذہنی ترقی کا نمایاں دور شروع ہوتا ہے، اس نے مشینری طیار کی اور اقطاعی دور ختم ہوکر کسانوں کی جگہ مزدوروں نے لے لی۔ مگر دور ترقی اب بھی اسی رفتار سے جاری ہے اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کی جگہ بڑے سے بڑے سرمایہ دار لے رہے ہیں۔ ان میں بھی باہم تصادم ہوتا ہے اور ایک کی کمزوری سے دوسرا فایدہ اُٹھاتا ہے۔ جس کا دوسرا نام ملوکیت ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آج کی ملوکیت پرانے زمانے کی ملوکیت نہیں ہے جو شخصی استبداد سے تعلق رکھتی تھی بلکہ اس کا تعلق تجارت و اقتصاد کی شاہنشاہی سے ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر تمام دنیا ایک بازار ہوکر رہ گئی ہے اور نظام حکومت

ایک سرمایہ دار تاجر۔ اس تجارتی تصادم اور اقتصادی کشمکش کا آخر میں صرف یہ نتیجہ ہوگا کہ تمام دنیا کی دولت جب ایک جگہ جمع ہو جائے گی تو وہ پھر سوسائٹی کے ہاتھوں میں پہونچ جائے گی۔ سوسائٹی کے انھیں افراد کے ہاتھوں میں جن سے لیکر وہ ایک جگہ جمع کی گئی تھی۔ حقیقتاً یہی وہ زمانہ ہوگا جسے ہم بالالفاظ دیگر انسانی تاریخ کی تکمیل کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔

اس قدر تمہید کے بعد اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مزدوروں کی تحریک کب شروع ہوئی، اس کی ابتدائی حالت کیا تھی اور وہ کونسے اسباب تھے جو اس تحریک کا باعث ہوئے۔

جب اُنیسویں صدی کی ابتدا میں مشینری کا آغاز ہوا تو کارخانہ دار مزدوروں سے کام لینے کے بجائے مشینوں سے کام لینے لگے کیونکہ اس سے ان کے ذاتی مفاد میں زیادہ اضافہ ہوتا تھا۔ لیکن اس سے سوسائٹی کا توازن خراب ہونے لگا یعنی اگر ایک طرف سرمایہ دار طبقہ مالی مفاد زیادہ حاصل کرنے لگا تو دوسری طرف محنت کش جماعت کی بیکاری بڑھنے لگی کیونکہ پہلے جس کام کی تکمیل کے لئے سو آدمی درکار ہوتے تھے اب مشینوں کی وجہ سے وہی کام دس آدمیوں سے نکلنے لگا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کو کم اُجرت پر کام کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا، یہی نہیں بلکہ انھیں اپنے آپ کو سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دیدینا پڑا اور اس طرح مزدوروں کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی اور سرمایہ داروں کی ہوس زرکشی بڑھنے لگی۔ ظاہر ہے کہ اس عدم توازن کی طرف سے مزدور طبقہ عرصہ تک بے خبر نہیں رہ سکتا تھا، چنانچہ اس کا احساس اس میں پیدا ہوا اور احساس کے ساتھ ہی ہیجان۔

یوں تو مزدور جماعت کو اپنی تنظیم کا خیال پہلے ہی پیدا ہو گیا تھا، لیکن سنہ ۱۸۶۰ء سے انگلینڈ، فرانس اور جرمنی میں یہ تحریک زیادہ قوی ہو گئی سنہ ۱۸۶۲ء میں لندن میں ایک تجارتی نمائش ہوئی جس میں فرانس کے مزدوروں کا ایک وفد اس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ کیا گیا اور اس کو انگلینڈ کے مزدور لیڈروں سے ملنے کا موقع ملا اور آخرکار ستمبر سنہ ۱۸۶۴ء میں بین الاقوامی مزدور لیگ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ۲۸ ستمبر کو اس کا ایک عام جلسہ کیا گیا جس میں انگلینڈ، فرانس، اٹلی اور جرمنی کے مزدور لیڈروں کے نمائندے شامل ہوئے۔ جرمنی کے نمائندوں میں سوشلزم کے مشہور بانی کارل مارکس بھی شریک تھے اور مقاصد لیگ کی اشاعت کی ساری ذمہ داری انھیں کے سر رکھی گئی۔

لیگ کے خاص مقاصد یہ تھے :۔ مزدوروں کی ایک آزاد پارٹی کا قیام۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حفاظت و ترقی کے لئے قانون بنوانا۔ کوآپریٹو جماعتوں کا قیام اور قومیت کے نام پر ایک ملک کی حکومت کا دوسرے ملک کی حکومت سے جنگ کرنے کی مخالفت۔

لندن اس بین الاقوامی لیگ کا مرکز بنایا گیا۔ اور اس کی مجلس عاملہ میں مارکس اور کچھ انگریز مزدور لیڈر شامل ہوئے۔ یہ بین الاقوامی مزدور لیگ مختلف ممالک کی مزدور پارٹیوں کے سامنے ایک معیار پیش کرنے میں تو ضرور کامیاب ہوئی مگر اس سے کوئی خاص عملی تحریک بروئے کار نہ آسکی۔

اس بین الاقوامی لیگ نے پانچ جلسے کئے جن میں ٹریڈ یونین۔ امداد باہمی۔ مزدوروں کی حفاظت اور زمین کی اصلاح وغیرہ پر خاص طور سے غور و خوض کیا گیا۔ پہلا جلسہ بمقام جنیوا سنہ ۱۸۶۶ء میں ہوا، دوسرا سال آیندہ لوسان میں تیسرا بمقام بروسلس سنہ ۱۸۶۸ء میں، چوتھا بمقام واسکے سنہ ۱۸۶۹ء میں اور سنہ ۱۸۷۲ء میں آخری بارہیگ میں۔ سنہ ۱۸۶۷ء تک لیگ پر فرانس کے زبردست انقلابی پرودھن کا اثر رہا اور اس کے بعد مارکس کا مگر اسی اثنا میں مشہور روسی انقلاب پسند باکونن لیگ میں شامل ہوا اور مارکس سے اس کی مخالفت ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باکونن نے لیگ کے اندر ایک خفیہ پارٹی بنائی جس کو لیگ نے کبھی منظور نہیں کیا۔ آخرکار اس جھگڑے میں لیگ کا دفتر نیویارک سے ہٹا دیا گیا اور سنہ ۱۸۷۶ء میں لیگ ہی کو توڑ دیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد سنہ ۱۸۸۹ء میں بہ مقام پیرس ایک عظیم الشان نمائش ہوئی اور اس موقع پر سوشلسٹ مزدوروں کی ایک کانگریس منعقد ہوئی۔ جسے بین الاقوامی مزدور لیگ کا نشاۃ ثانیہ کہنا چاہئے بین الاقوامی مزدور لیگ کی نگرانی میں آٹھ کانگریسیں ہوئیں۔ اور سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد اس کا دفتر بروسلیس میں قائم کیا گیا اور سنہ ۱۹۱۰ء تک اس کی یہی کوشش رہی کہ سوشلسٹ اور انارکسٹ باہم ملنے نہ پائیں۔

سنہ ۱۹۱۴ء تک کانگریس نے کل طور پر یہ طے کر لیا کہ خاص وجوہ کے علاوہ کوئی سوشلسٹ کسی غیر سوشلسٹ حکومت سے تعلق نہ رکھ سکے گا چنانچہ اس کے خلاف عمل کرنے اور فرانس کی وزارت منظور کر لینے کے جرم میں اسے لیگ سے علحدہ کر دیا گیا۔ یہی حالت فرانس میں بریا اور اٹلی میں بیباقی کی ہوئی۔ مگر جنگ کے وقت اور جنگ کے بعد یہ شرط قایم نہ رہی۔ سنہ ۱۹۰۴ء کے بعد یہ لیگ کچھ سہولت پسند ہوگئی تھی اس لئے امپیریلزم کے لئے یہ لیگ صاف طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اسٹڈ کارٹ کانگریس میں گستاؤ ہروے نے یہ رزولیوشن پیش کیا کہ جنگ کے خلاف مزدوروں کو اپنے انتہائی حربوں سے کام لینا چاہئے۔ لیکن کوئی اصول طے نہ پا سکا

اگرچہ سنہ ۱۹۱۴ء کے جنگ عظیم کے زمانہ میں تمام بندشیں ختم ہوگئی تھیں مگر پھر بھی کچھ ایسی ہستیاں ضرور تھیں، جو اپنے اصول پر آخر تک کاربند رہیں، اور انھوں نے سنہ ۱۹۱۵ء میں تیسری بین الاقوامی مزدور لیگ قایم کرنے کے متعلق ذکر کرنا شروع کیا۔ اس میں جرمن، روس، فرانس اور بعض دوسرے ممالک کے نمایندے شریک تھے۔ اس کانفرنس نے جماعتی جنگ و جدل کو عملی صورت دینے کے متعلق غور کیا اسکے بعد سنہ ۱۹۱۶ء میں ایک اور کانفرنس ہوئی۔ ان دونوں کانفرنسوں میں انگریزی حکومت نے نمایندوں کو

پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا - اور اس کے ساتھ ہی بہت سے دوسرے ملکوں نے بھی مخالفت کی آواز اُٹھائی تھی - ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد اس کا ایک حصہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا جو بولشیوک پارٹی کے نام سے مشہور ہے اور ۱۹۱۷ء کا انقلاب روس اسی پارٹی کا کام تھا - روس کی اس انقلاب پسند جماعت نے دوسری بین الاقوامی مزدور لیگوں کو بیکار قرار دیکر مارچ ۱۹۱۹ء میں تھرڈ انٹرنیشنل پارٹی کی بنیاد ڈالی -

آج کمیونسٹ بین الاقوامی لیگ میں ۶۲ ملک شامل ہیں - جہاں کمیونسٹوں کو طرح طرح کے مظالم کا سامنا کرنا پڑتا ہے - چین میں کمیونسٹ پارٹی کے آج ۴ لاکھ ۱۰ ہزار ممبر ہیں - ان میں سے آدھے تو سوویٹ چین کی حفاظت کے لئے لال فوج میں شامل ہیں - اور ۴۸ ہزار کمیونسٹ چین کے دشمن ٹنگ حکومت میں اپنے انقلابی کاموں میں لگے ہوئے ہیں - جہاں کی حالت یہ ہے کہ اگر حکومت کو کسی پر کمیونسٹ ہونیکا شک بھی ہو جائے تو اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے - جرمنی میں ہٹلر کے خلاف ..... ۹ کمیونسٹوں کی جماعت جدوجہد کر رہی ہے - اگرچہ جرمنی کی نازی حکومت نے انھیں مٹا دینے کے لیے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی - مگر پھر بھی جرمن مزدوروں کی انقلابی پارٹی ۱۹۱۷ء کے بولشیوکوں کی تعداد سے چارگنا زیادہ ہے - جاپان کی حکومت بھی اسی طرح ہر سال یہ دعوے کرتی ہے کہ اس نے کمیونزم کو بالکل ختم کر دیا ہے اور جاپان میں ..... کمیونسٹ جیل کے اندر بند ہیں مگر کمیونزم اپنا اثر دکھاتی ہی رہتی ہے - چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ سوویٹ روس کے علاوہ کمیونسٹوں کی تعداد ۸ لاکھ ۷۵ ہزار سے بھی زیادہ ہے -

رسول احمد ابوده

سرمہ کاجل چورن منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے

کاجل — آشوب سرخی ضعف بصارت کے لئے از بس مفید ہے ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لیے سال بھر کو کافی ہے قیمت عمر

سُرمہ — یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں ممیرہ نہیں بلکہ معمولی سرمہ ہے جس کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں تیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا دھند موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے - قیمت فی پڑیہ عمر علاوہ محصول -

چورن — یہ وہ اکسیر چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے پیٹ کا درد قبض نفخ ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم دستوں کا آنا سب یک لخت اسکے استعمال سے جاتا رہتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ عمر علاوہ محصول

منجن — اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ اس سے ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں - قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عمر علاوہ محصول

(نوٹ) سب چیزیں منگانے والے کو محصول ڈاک معاف - پتہ :- م بیگم ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

وجود روح - تناسخ - حاضرات

(جناب سید علیم الدین صاحب - جہان آباد)

آپ موت کے بعد بقار روح کے قایل نہیں ہیں اور چونکہ اسی عقیدہ پر مذاہب کی بنیاد قائم ہے اسی لئے آپ مذہب کی اہمیت کا بھی اعتراف نہیں کرتے، لیکن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ حاضرات کرکے روحوں کو بلاتے ہیں ان سے سوالات کرتے ہیں اور وہ جواب دیتی ہیں۔ مغرب میں سر آلیور لاج، کینن ڈایل وغیرہ بڑے بڑے لوگ بقار روح کے قایل ہیں اور ارواح سے مخاطبت کے قایل ہیں۔ خود ہمیں ہندوستان میں متعدد واقعات اسی قسم کے سُنے گئے ہیں جن سے نہ صرف وجود روح بلکہ اس کے احساس و بقار حافظہ کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں دہلی کے کسی ہندو خاندان کی کمسن لڑکی نے بتایا کہ وہ اپنے اگلے جنم میں متھرا کے کسی خاندان میں پیدا ہوئی تھی وہیں اس کی شادی ہوئی اور وہیں اس کے اعزہ موجود ہیں چنانچہ اس کی نشاندہی پر جب جستجو کی گئی تو اس کا بیان حرف بحرف صحیح نکلا۔ براہ کرم مطلع فرمایئے کہ اس باب میں آپ کیا کہتے ہیں۔۔

(نگار) یہ بالکل صحیح ہے کہ میں موت کے بعد بقار روح کا قایل نہیں ہوں، لیکن یہ درست نہیں کہ میں اسی بنیاد پر مذاہب کی اہمیت سے انکار کرتا ہوں، چونکہ میں موجودہ دنیا کے علاوہ کسی اور ایسی دنیا کا قایل نہیں ہوں، جس کو اس دنیا کا تتمہ کہہ سکیں اور آخرۃ و یوم آخرۃ کو میں اسی دنیا کے انجام اور اسی دنیا کے نتائج اعمال و افکار سے متعلق سمجھتا ہوں، اس لئے ظاہر ہے کہ مذہب کی افادی حیثیت میرے نزدیک دنیا سے علحدہ کسی اور عالم سے وابستہ نہیں ہو سکتی، اور اسی لئے میں مذہب کو ایک ایسا سماجی قانون سمجھتا ہوں جس کا مقصود ہماری

اسی زندگی کو سنوارنا، اور اسی دنیا کے تمدن کو قایم رکھنا ہے۔

میری جنگ مذہب و اہل مذہب سے یہ نہیں ہے کہ میں سرے سے مذہب ہی کو بری چیز سمجھتا ہوں بلکہ اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ وہ مذہب کی بنیاد حیات بعد الموت کو قرار دیتے ہیں اور میں یہ کہتا ہوں کہ مذہب کا مدعا ہماری اسی زندگی کو سنوارنا ہے۔ اگر یہ زندگی اور یہ دنیا بالکل مہمل چیز ہے اور اصل حیات وہی ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والی ہے (جیسا کہ عام اہل مذاہب کا خیال ہے) تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

یہ تمنائیں، یہ کاوشیں، یہ تگ ودو، یہ جذبات و تاثرات، یہ تمدنی وابستگیاں، یہ عمرانی دلچسپیاں، یہ مناظر لذت والم، یہ ہنگامہ کیف وکم کیا خدا نے بالکل بیکار پیدا کئے ہیں اور اگر یہ دنیا صرف دار العمل ہے تو کیا ہمارے وہ تمام افعال وکردار جن کے ظہور و صدور میں ہمارے جوارح، ہمارے جسمانی اعضا نے اتنا نمایاں حصہ لیا ہے کسی ایسی دنیا میں مستوجب جزا و سزا قرار دئے جائیں گے جہاں اس جسم کا وجود ہی نہ ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ انسانی حشر و نشر اسی جسم کے ساتھ ہوگا اور بالکل یہی انسان انھیں احساسات کے ساتھ زندہ کیا جائے گا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسی دنیا میں یہ سب کچھ نہ ہو اور خواہ مخواہ بگاڑنے بنانے کی زحمت اختیار کی جائے۔ الغرض میں مذہب اور مذہب کی اہمیت کا منکر نہیں ہوں لیکن اس کو اسی دنیا کے فلاح و بہبود کا ذریعہ قرار دیتا ہوں۔ نہ آیندہ احیار ثانی کی کوئی ضرورت ہے اور نہ اس سے مذہب کا کوئی تعلق ہونا چاہئے۔ یہ تو خیر ایک ضمنی گفتگو تھی جو آپ کے ایک ضمنی اعتراض کے جواب میں کی گئی۔ اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ بقار روح کے ثبوت میں جو دلایل طلب ارواح یا مخاطبت ارواح وغیرہ کے پیش کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔

اس امر کے ثبوت میں دو قسم کے دلایل پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق صرف عقل سے ہوا کرتا ہے اور دوسرے وہ جو مشاہدات سے متعلق ہوتے ہیں۔ پھر اس میں کلام نہیں کہ اہل مذاہب نے دونوں ہی قسم کے دلایل پیش کئے ہیں لیکن اسوقت تک وہ کسی ایک میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ عقلی دلایل کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے، کیونکہ جب تک حیات بعد الموت کی ضرورت کو ثابت نہ کیا جائے روح و بقار روح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، رہگئے مشاہدات سو ان کی بنیاد یا تو ان بھوت پریت کی روایات پر قائم ہے جو عام طور سے بیان کئے جاتے ہیں یا پھر روحانیین مغرب کے اس دعوے پر کہ روحیں ان سے خطاب کرتی ہیں اور وہ روحوں کو طلب کر کے ان سے ہمکلام ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ عمل حاضرات اور ان روایات کو بھی لے لیجئے جو تناسخ کے ثبوت میں بیان کی جاتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بھوتوں کی اتنی روایات زبانزد ہیں اور اتنے وثوق کے ساتھ ان کو بیان کیا جاتا ہے کہ ان سب کو غلط قرار دیتے ہوئے پس و پیش ہوتا ہے لیکن اگر جستجو کی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ان روایات میں ۹۹ فیصدی ایسی ہیں جو صرف سماعی ہیں اور باقی ایک جو ذاتی تجربہ کی حیثیت رکھتی ہے وہ بھی صرف تخیل واہمہ ہے اور کچھ نہیں۔ میں نے خود ایک زمانہ میں کافی تحقیق اس امر کی کی کہ جو روایات بعض آسیب زدہ مقامات کی نسبت بیان کی جاتی ہیں وہ درست ہیں یا نہیں۔ چنانچہ راتوں کی تنہائی میں، برسات کی تاریکیوں میں بارہ بارہ گھنٹے میں نے وہاں بسر کئے لیکن مجھکو نہ کسی آسیب نے ستایا اور نہ کسی جن نے۔ رہ گیا ثبوت تناسخ میں بعض ایسی روایات کا مشہور ہو جانا کہ فلاں بچہ نے اپنے گزشتہ زندگی کے حالات بیان کئے اور تحقیقات سے ان کی تصدیق بھی ہوئی، میں اسے ہندوؤں کا صرف پروپاگنڈا قرار دیتا ہوں۔ کسی کمسن بچہ سے کچھ باتیں کہلوا دینا اور پھر اس کی تصدیق بھی دوسروں سے کرا دینا چنداں دشوار نہیں جبکہ قتل کے مقدمات میں بھی جھوٹے گواہ بہ آسانی میسر آ سکتے ہیں۔ ایسے بچے ہمیشہ ہندو ہی گھرانوں میں پیدا ہوتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں، مسلمانوں میں کوئی ایک واقعہ بھی اس کا نظر نہیں آتا۔

اس سلسلہ میں آپ نے سب سے زیادہ مرعوب کن بات جو لکھی ہے وہ روحانیین مغرب کا بیان ہے جس کے سب سے بڑے علمبردار سر الیور لاج اور کینن ڈائل تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس باب میں، اپنے خیالات ایکبار ظاہر کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ یورپ کے یہ اعمال روحانی دکھانے والے دو قسم کے ہیں ایک وہ جو جان بوجھ کر لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو واقعی بقاء روح اور اس سے مخاطبت کے قایل ہیں۔ اول الذکر جماعت کے متعلق بہ کثرت ایسے بیانات شائع ہو چکے ہیں جن سے انکا مکر و فریب ثابت ہوتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ پروفیسر ہوڈینی نے تو اس جماعت کو اس بری طرح بے نقاب کیا ہے کہ اب طلب ارواح کا دعوے کرنے کی ہمت ہی کسی میں نہ ہونا چاہئے۔ موخر الذکر جماعت بیشک مکار نہیں ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ خود فریب نفس میں مبتلا ہے اور واہمہ کی شکار۔

میں جن اسباب کی بنا پر تخاطب ارواح کا قایل نہیں ہوں ان میں سے چند یہ ہیں :۔

ا۔ اس وقت تک مرنے والوں میں کافی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو بقاء روح کے قایل تھے، جو تخاطب ارواح کے بڑے زبردست حامی تھے اور منکرین کو لامذہب بے دین اور کافر قرار دیتے تھے، لیکن جب تک وہ زندہ رہے اس وقت تک تو اس کا پرچار بڑی قوت سے کرتے رہے لیکن مرنے کے بعد ان کی روحوں نے کوئی ثبوت اپنے وجود کا پیش کر کے منکرین کو قایل نہیں کیا۔ اگر جسم سے جدا ہونے کے بعد روح واقعی قائم رہتی ہے اور وہ ہم سے خطاب کر سکتی ہے یا ہماری سن سکتی ہے تو اہل مذاہب و روحانیین

کی روحوں نے کیوں نہ مرنے کے بعد اس حقیقت کو ہم پر واضح کیا اور اس کفر و بیدینی کو کیوں جاری رہنے دیا۔

۲۔ طلب ارواح کے بعض بڑے بڑے دعوی کرنے والوں نے اخیر میں اس کا اعتراف کیا کہ جو کچھ وہ کہتے تھے محض دھوکا تھا اور جو دکھاتے تھے وہ بھی شعبدہ اور نظربندی سے زیادہ نہ تھا۔ ڈاکٹر سلایڈ نے ایک زمانہ تک لوگوں کو اسی فریب میں مبتلا رکھا کہ وہ روحوں کو بلاتا ہے جو تختی پر سوالوں کا جواب لکھتی ہیں لیکن آخر آخر اس نے خود اپنا پردہ فاش کر کے بتایا کہ وہ اس عمل میں کن چالاکیوں سے کام لیتا تھا۔ مغرب کی دو مشہور عورتوں مارگریٹ اور کیٹی کا حال اس سے قبل ہم کسی اشاعت میں بیان کر چکے ہیں کہ طلب ارواح کا تماشہ دکھانے میں کتنا زبردست جال انھوں نے پھیلا رکھا تھا۔

۳۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جو روحیں طلب کی جاتی ہیں وہ سوائے ادنیٰ معمولی باتوں کے کوئی اور بات نہیں کرتیں۔ اگر ارواح کی رسائی وہاں تک ہے جہاں تک ہمارا ذہن نہیں پہونچ سکتا اگر واقعی وہ لوگوں کے دلوں کا حال معلوم کر سکتی ہیں اور فطرت کے رازوں سے آگاہ ہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ کوئی علمی خدمت انجام نہیں دیتیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ ہماری حیات کی بہت سی گتھیوں کو سلجھائیں، مسائل علمی کا حل بتائیں، ہماری مشکلات کو دور کریں، ایجادات و اختراعات کے بارے میں رہنمائی کریں۔ لیکن بجائے اس کے اُن کے پیغامات سوائے کھانے پینے رہنے سہنے اور گانے بجانے کے اور کسی اہم مسئلہ سے متعلق نہیں ہوتے۔

۴۔ وہ لوگ جو تخاطب ارواح کے قائل ہیں وہی ہیں جن کے قوائے عصبی قدرتی طور پر کمزور واقع ہوئے ہیں۔ پھر جوں جوں وہ طلب ارواح کی مشق کرتے جاتے ہیں، اُن کے اعصاب اور زیادہ ضعیف ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ بالکل مجنون ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے دماغ و اعصاب کا یہ عالم ہے ان کے احکام و تصورات پر کیا یقین لایا جا سکتا ہے۔

مغربی مصنفین اور مشرقی عورت

(جناب محمد زکریا خاں صاحب - علی گڑھ)

مغرب کے اہل قلم نے مشرقی عورت کا ذکر جب کبھی کیا، ہمیشہ اس سے یہی ثابت ہوا کہ یہاں کی عورت جاہل تھی، کنیز تھی، بیکس و لاچار تھی اور یہ کہ مردوں نے کبھی اس کی ترقی و تعلیم کی طرف توجہ ہی نہیں کی اور یہ الزام خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں پر زیادہ شدت کے ساتھ

قایم کیا جاتا ہے، پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسلمان عورتوں کا موجودہ پردہ، ان کی خانگی زندگی اور ان کی تعلیمی پستی کو دیکھ کر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ مغربی مصنفین کا بیان حقیقت سے خالی نہیں ہے اور اسلام نے عورت کی اصلاح کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی کیا آپ اس مسئلہ میں اپنے خیالات ذریعہ نگار ظاہر کریں گے۔

(نگار) یہ بالکل صحیح ہے کہ اہل مغرب مشرقی عورت کی جو تصویر پیش کرتے ہیں وہ نہایت مکروہ ہوتی ہے، لیکن یہ کہنا کہ مشرق کی عورت ہمیشہ سے ایسی ہی مجبور و نااہل رہی ہے درست نہیں اور یہ تو سراسر غلط ہے کہ اسلام نے عورت کی اصلاح و تعلیم کی طرف سے بے پروائی کی۔

ملکہ سبا، عرب ہی کی عورت تھی جس نے یمن اور بیت المقدس پر حملہ کر کے حکمۃ سلیمان کی اشاعت کی۔ زنوبیا بھی تدمر کی رہنے والی اور مشرق ہی کی عورت تھی جو ہومر کی شاعری کی دلدادہ تھی اور جس نے ایک زمانہ تک جیوش رومہ کا مقابلہ کر کے اپنے وطن کی حفاظت کی اور جناب خدیجۃ الکبریٰ بھی سرزمین عرب ہی کی خاتون تھیں جن کے قافلۂ تجارت جزیرۃ العرب اور دمشق کے درمیان آیا جایا کرتے تھے، خنساء بھی عورت تھی اور مشرق ہی کی عورت تھی جس نے اپنی شاعری کا سکہ بڑے بڑے مرد شعراء کے دلوں پر بٹھا رکھا تھا۔

عہد نبوی میں بھی ایسی متعدد عورتیں تھیں جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ چنانچہ بلاذری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں منجملہ ان سترہ لوگوں کے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے چار یا پانچ عورتیں تھیں خود رسول اللہ کو عورتوں کی تعلیم کا جس قدر خیال تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ آپ نے شفا بنت عبداللہ کو بلا کر حکم دیا کہ وہ جناب حفصہ کو کتابت کی تعلیم دے۔ ام کلثوم کا خواندہ ہونا بھی تاریخ سے ثابت ہے اور علاوہ ان کے عائشہ بنت سعد، کریمہ بنت المقداد اور ام سلمہ بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔

علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں بہت سی ان مشہور عورتوں کا حال لکھا ہے جو روایت احادیث کے ذریعہ سے تاریخ اسلام میں اپنے نقوش چھوڑ گئی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیق کی دو صاحبزادیوں جناب عائشہ و اسماء کا حال کون نہیں جانتا۔ حضرت عائشہ کی ذہانت و فطانت اور امور سیاسی میں ان کے اقدامات تاریخ کے روشن واقعات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو ایک ہزار احادیث یاد تھیں۔ ان کی بہن اسماء نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ جنگ یرموک میں اپنے شوہر کے ساتھ آپ کا شریک ہونا اور اپنے بیٹے کو حجاج کے مقابلہ میں یہ کہہ کر روانہ کرنا (یا بنی ۱؎ عش کریما و مت کریما) وہ واقعات

۱؎ اے میرے بیٹے زندہ رہنا ہے تو عزت کے ساتھ زندہ رہ اور مرنا ہے تو عزت کے ساتھ جان دے۔

ہیں جن سے آپ کے بلند و پاکیزہ اخلاق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح ام الدرداء سے تاریخ اسلام کا ہر طالب علم واقف ہے کہ آپ کو علم سے کتنا شغف تھا اور آپ کس قدر ذہین و باخبر تھیں۔

یہ زمانہ وہ تھا جب لڑکیوں یا لڑکوں کی تعلیم کا بھی کوئی خاص انتظام نہ تھا اور صرف فطرت کی رہنمائی سے انھوں نے یہ سب کچھ حاصل کیا تھا لیکن اس کے بعد جب باقاعدہ درس و تدریس کا دور آیا تو لڑکیاں مدرسوں میں بھی بھیجی جانے لگیں۔ آج انتہائی ترقی یافتہ ممالک ہی میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن اب سے ایک ہزار سال قبل عہد اسلام میں طریقۂ تعلیم بالکل یہی تھا اور لڑکے لڑکیاں پہلو بہ پہلو سب ساتھ ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ کوفہ میں بھی ایک مدرسہ ایسا موجود تھا جہاں نہ صرف کمسن بلکہ نوجوان لڑکیاں بھی پڑھنے جایا کرتی تھیں، چنانچہ اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ کوئی نوجوان کسی لڑکی پر عاشق ہو گیا جو مدرسہ جایا کرتی تھی اور اس نے مدرسہ کے اُستاد (خلیل) سے ساز باز کر کے نظارہ بازی کی فرصت حاصل کر لی۔ ایک بار اموی خلیفہ عبدالملک خود اس مدرسہ میں گیا اور اس نے وہاں کنیزوں کو بھی تحصیل علم میں مصروف پایا۔

اس واقعہ سے نہ صرف شرفاء کی لڑکیوں بلکہ کنیزوں کی تعلیمی حالت پر بھی روشنی پڑتی ہے اور تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو جو تعلیم دی جاتی تھی وہ نہایت بلند و اعلیٰ قسم کی ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جس وقت خلیفہ ہارون رشید کے سامنے ایک کنیز پیش ہوئی اور اس کی قیمت دس ہزار دینار طلب کی گئی تو خلیفہ نے حکم دیا کہ اس کا امتحان لیا جائے چنانچہ فقہ و تفسیر، طب و فلسفہ، ادب و موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین نے اس کا امتحان لیا اور ایسے جواب اس نے دیئے کہ سب دنگ ہو کر رہ گئے۔

ایک بار خالد ابن عبداللہ نے تین کنیزیں خریدیں جن میں سے ہر ایک شعر و ادب، غناء و موسیقی میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ اسپین سے لائی ہوئی ایک کنیز کو نحو و لغت کی اتنی زبردست تعلیم دی گئی کہ ان دونوں فنوں میں اس نے سند و حجت کی حیثیت اختیار کر لی۔

وہ مسلمان جو آج عورتوں کے پردہ کے حامی ہیں اور جو لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کے پڑھنے کے مخالف ہیں ان کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ عرب کے مسلمانوں میں نہ پردہ کا رواج پایا جاتا تھا اور نہ تعلیم کے باب میں وہ اتنے آزاد تھے کہ لڑکے لڑکیوں دونوں کو ایک ہی مدرسہ میں بھیج دیتے تھے۔ عرب کی عورتیں ہمارے ہندوستان کی عورتوں کی طرح قفس میں بند نہ رہتی تھیں بلکہ وہ ان کے ساتھ میدان جنگ میں جاتی تھیں، زندگی کی تمام مشکلات میں مردوں کا ساتھ دیتی تھیں اور شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ وہ یورپ کی موجودہ عورت کی طرح بال بھی کٹوا دیتی تھیں۔

ابن خلکان اور المقری کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کی بعض عورتوں نے علوم وفنون کی اشاعت میں بھی خاص حصہ لیا تھا۔ چنانچہ شہدہ بنت ابی نصر نے تعلیمی مہارت میں خاص شہرت حاصل کی تھی اور کثرت سے طلبہ کو درس دیا کرتی تھی اور جب امام شافعی قاہرہ پہونچے تو نفیسہ بنت ابی محمد کے پاس جاکر متعدد احادیث کی سند حاصل کی۔

ابوحیان کا بیان ہے کہ اساتذہ میں سے جو درس دیا کرتے تھے تین عورتیں بھی تھیں۔ ایک مونسہ بنت الملک العادل، دوسری شامیہ بنت الحافظ، اور تیسری زینب بنت عبداللطیف۔ ان کے علاوہ ایک اور معلمہ شہدہ بنت عنبری بھی تھی جس نے عبدالرحمان الفقیہ کو بخاری کا درس دیا تھا۔

اشبیلیہ میں مریم بنت ابی یعقوب شاعرہ بھی تھی اور لغت وانشاء کا درس بھی دیا کرتی تھی۔ یاقوت کی روایت ہے کہ ابن عساکر نے ۱۲۰۰ اُستادوں سے پڑھا تھا جن میں ۸۰ عورتیں تھیں۔ ابن خلکان کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لڑکیاں مدرسوں سے فارغ ہوکر نکلتی تھیں ان کو سند بھی دیجاتی تھی۔

الغرض یہ کہنا کہ اسلام نے عورتوں کی تعلیم واصلاح کی طرف توجہ نہیں کی یا یہ کہ تاریخ اسلام ایسی عورتوں کے وجود سے خالی ہے سراسر الزام ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان کی مسلمان عورت کو دیکھکر کبھی ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوسکتا کہ کسی وقت اسلام نے اس کی ذہنی تربیت کی طرف توجہ کی ہوگی لیکن جو لوگ تاریخ سے آگاہ ہیں ان کے لئے سب سے زیادہ حیرتناک امر یہی ہے کہ جس مذہب نے عورت کے مرتبہ کو اس قدر بلند کرنا چاہا تھا اور جس اسلامی تہذیب نے اس جنس کو سرحلکون ترقی کے لئے آزاد چھوڑ دیا تھا وہ آج کیوں عورت کی آزادی وترقی کا اس قدر مخالف ہو۔

مصر میں عورت آزاد ہوچکی، ترکی میں وہ مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگی، ایران میں اس نے نقاب نوچکر پھینک دیا، شام وفلسطین، دمشق وعراق میں وہ برافگندہ نقاب مدرسوں میں جانے لگی، لیکن ہندوستان کی عورت ہنوز غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کیونکہ مسلمان مردوں کی ذہنیت کونسی ایسی بلند ہے کہ عورتوں کی پستی پر حیرت کی جائے۔

ضرورت ہے

رشتہ کی ایک ۱۸ سال کی نا کتخدا لڑکی کے لئے جو معزز خاندان کی نہایت قبول صورت، تعلیم یافتہ، صحیح وتوانا، سلیقہ مند، سلیم الطبع سینے پرونے اور کاڑھنے کی ماہر ہے۔ انگریزی نہیں جانتی۔ صرف وہ اصحاب خط وکتابت کریں جو برسر روزگار ہیں یا کوئی ذاتی معقول آمدنی رکھتے ہیں۔

ن۔ م۔ ذریعہ منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

خان محترم ۔ کل ہی بیس دن کے بعد ایک طویل سیاحت سے واپس آیا ہوں اور نہ صرف جسم بلکہ دل و دماغ کی خستگی کا بھی یہ عالم ہے کہ کسی معقول بات کے سوچنے سے بھی جی گھبرا اُٹھتا ہے۔ لیکن جب کوئی نامعقول مشغلہ دل بہلانے کا میسر نہ ہو تو چار و ناچار عقل کی سرزہ کاریوں ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔

ڈاک دیکھی اور سب سے پہلے آپ کے خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا، لیکن سوچ رہا ہوں کہ آخر لکھوں کیا۔ آپ کے خط کی اہمیت حد درا عتدال حواس چاہتی ہے اور یہاں جو کیفیت ذہن و دماغ کے عدم توازن کی ہے اسے عرض ہی کر چکا ہوں۔ چونکہ آپ سے بہت ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ "ہوش میں آلوں تو کہوں" کا عذر آپ کی بارگاہ میں کبھی مسموع ہو نہیں سکتا اس لئے جو بات سب سے زیادہ اہم ہے اس کے متعلق تو اپنی رائے ظاہر کئے دیتا ہوں اور باقی اُمور کا فیصلہ "وقت دگر" پر اُٹھا رکھتا ہوں۔

سنئے، اگر آپ نے اس مسئلہ کو صرف اس لئے دوبارہ چھیڑا ہے کہ چار سال کی مدت آپ کے نزدیک مجھے "پیر خرف" بنا دینے کے لئے کافی ہے اور اب میں آپ کے ہم آہنگ ہو جاؤں گا، تو مجھے افسوس ہے کہ آپ کا یہ خیال درست نہیں لیکن اگر مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ اس کام کے کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور میری تائید یا کسی کی مخالفت اب اس کی مزاحم نہیں ہو سکتی تو پھر اس "استشارہ و استشہاد" کی کیا ضرورت تھی۔ بُری بات کرنے کا بدترین طریقہ یہی ہے کہ پہلے اس کے لئے کوئی بہترین توجیہہ تلاش کی جائے۔ آپ اگر کسی کو ناحق ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو بیشک ہلاک کر ڈالئے لیکن یہ تو نہ کہئے کہ جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں وہ درست بھی ہے۔ مکروریا کی یہ ایسی ذلیل صورت ہے کہ کم از کم آپ ایسے جری انسان کو ضرور اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

مجھ سے اسلم صاحب نے زمانہ ہوا کہ خط و کتابت بند کر دی ہے اور اگر آپ یہ نہ لکھتے کہ وہ بمبئی میں ہیں تو مجھے یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے۔ موجودہ حالات اگر آپ کے لئے اطمینان بخش ہیں تو بسم اللہ اُن کو بلا کر یا خود وہاں جا کر کام کی طرح ڈال دیجئے۔ یہ ساعت آسمان بلاوجہ تو گردش میں ہے نہیں، کوئی نہ کوئی فتنہ بپا ہو ہی جائے گا۔

عزیز گرامی۔ آپ مجھے صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہیں، اس ہمدردی و دلنوازی کا شکریہ لیکن آپکو شاید معلوم نہیں کہ تعلقات محبت و خلوص کے باب میں ضبط کا مفہوم میرے نزدیک بھی وہی ہے جو سعدی کا تھا یعنی یہ کہ

دوستی نیست دراں دل کہ شکیبائی ہست

آپ جانتے ہیں کہ میں "دل کے خون ہو جانے" سے کبھی نہیں ڈرتا اور نہ کبھی آج تک اس کی شکایت میں نے کسی سے کی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا مجھ سے دعوائے محبت کرے اس حال میں کہ "باندازۂ خلشِ خار" بھی اس نے کوئی تکلیف برداشت نہیں کی ہے۔ بہر حال اگر وہ میری خواہش کے خلاف یہ اقدام کر چکے تھے تو آپ نے اس کا ذکر ہی کیوں کیا اور اگر کیا تھا تو کم از کم یہ تعزیت و تلقین کی صورت تو اختیار نہ کی جاتی۔ مجھے زبان پر قابو حاصل ہے لیکن غم و غصہ پر نہیں — کہوں گا نہیں لیکن کڑھوں گا ضرور۔ آپ کو ان کی معذوریوں پر تو بہت رحم آتا ہے، کبھی میری مجبوریوں پر بھی رحم آجائے تو کیا گناہ ہے۔

کرم گسترا۔ آپ نے جو کچھ فرمایا بالکل درست، جو تدبیریں آپ نے سوچی ہیں مانا کہ تیر بہدف لیکن اسکا کیا علاج کہ

بہ کارسازیِ بخت خود اعتقادم نیست

میری مراد یہاں "بخت" سے وہ قوت مجہول نہیں جو اپنے بنائے کاموں کو بگاڑ دینے میں خاص شہرت رکھتی ہے، اور نہ وہ "ربانی لوح" جس پر میرے گناہوں اور بطار گرام کے اعمال حسنہ کی پوری فہرست بہ قید وقت منقوش ہے — بلکہ مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ میں اپنی افتاد طبیعت کو کیا کروں جو اس حد تک گر کر حصولِ مراد کو بھی ناکامی تصور کرتی ہے۔

جب تک کسی خواہش کا اظہار صرف "آنکھوں" سے ہو رہا ہے، وہ تمنا ہے لیکن زبان سے کہا اور اس نے گدائی کی صورت اختیار کر لی۔ پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ جو اتنا شدید احمق ہو اس کو مجبور کرنا کہ وہ کہے اور بار بار کہے، "کتنی عظیم الشان دانائی کی ذمہ داری اس کی گردن پر رکھنا ہے۔

یقیناً بے نیازانہ زندگی بسر کرنے کے اسباب مجھے حاصل نہیں ہیں، لیکن اتنا تو آپ بھی جانتے ہونگے کہ یہ نتیجہ ہے انھیں اسباب کی طرف سے بے نیازی کا میں جس سے لڑتا نہیں اس سے ڈرتا بھی نہیں، خدا سے میں نے کبھی جنگ نہیں کی تو اس سے کیوں ڈروں۔ جسم و روح سب کو فانی سمجھتا ہوں اور اس

"المکدہ روزگار" میں سب سے بڑی تسکین میرے لئے یہی ہے۔ آپ کیوں اپنا وقت میری ہمدردی میں خراب کریں۔

بادلشدگاں ہر کہ در افتاد، بر افتاد

مکرمی۔ آپ کا خط تو جواب طلب نہ تھا، لیکن چونکہ خود مجھے ایک بات آپ سے پوچھنا ہے، اس لئے یہ عریضہ پیش کر رہا ہوں۔ وہاں ایک صاحب ہیں جو وفا تخلص کرتے ہیں۔ غالباً دو محلے میں رہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ان کے پاس ایک قلمی نسخہ کلیات مومن کا ایسا موجود ہے جسے خود مومن نے درست کیا تھا۔ راوی خود اپنا دیکھنا تو بیان نہیں کرتے لیکن ان کے انداز بیان میں اتنا وثوق ہے کہ خواہ مخواہ اعتبار کر لینے کو جی چاہتا ہے۔

اگر آپ سے وفا صاحب کے مراسم ہوں تو اس کا پتہ لگائیے اور لکھئے کہ کیا وہ بیک نظر اس نسخہ کے مطالعہ کی اجازت دے سکتے ہیں؟

میں خود وہاں آنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ خود اسے ایکبار دیکھ کر یہ کہیں کہ واقعی دیکھنے کی چیز ہے۔

جناب من۔ تسلیم۔ آپ نے میرے تبصرہ کو بہ امعان نظر دیکھا۔ شکریہ۔ یقیناً مسائل تصوف آپ کے ممدوح بھی نظم کرتے ہیں اور میر درد بھی نظم کرتے تھے، لیکن یہ آپ کو کیونکر سمجھاؤں کہ

دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

آنسو ٹپکا دینا رونا نہیں ہے اور نہ باچھیں پھاڑ دینا ہنسنا۔ حال و قال کے فرق سے اگر آگاہ ہوتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ "آورد" و "آمد" میں کتنا تفاوت ہے۔ شاعری کی جان صرف "جذبۂ بے اختیار" ہے نہ کہ عاقلانہ حزم و احتیاط، یہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اصغر صاحب نے ابن عربی کے فصوص الحکم کی شرح لکھی ہے لیکن خدا کے لئے اسے غزلیات کا دیوان نہ کہئے۔

مکتوبات نیاز

ادب و انشاء کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آپ کو اردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و مضحکات، شوخی و رنگینی سلاست و بے ساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات، کاغذ دبیز، قیمت معہ محصول ۱۲/ار۔ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے۔

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

اعتبارات

دوسری دُنیا کی زبان

پیدا ہونے کے تین دن بعد میں ریشمی گہوارہ میں پڑا ہوا، اپنے چاروں طرف نئی دنیا کو عجیب حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا کہ میری ماں نے میری دایہ سے پوچھا۔ "آج میرے بچہ کا کیا حال ہے"۔ اس نے جواب دیا "بی بی، نہایت اچھا حال ہے، آج تین دفعہ میں نے دودھ بھی پلایا اور ایسا خوش تو میں نے کبھی کسی بچہ کو دیکھا ہی نہیں"۔

میں نے یہ سنا اور غصہ سے بیتاب ہو کر ایک چیخ ماری جس کا مطلب یہ تھا کہ "اے ماں، اس کے کہنے کا اعتبار نہ کرو، کیونکہ میرے گہوارے کے گدّے بھی سخت ہیں اور جو دودھ اسنے پلایا وہ تلخ تھا، اسکی چھاتیوں سے بُو آ رہی تھی" لیکن نہ میری ماں نے میری زبان کو سمجھا اور نہ میری دایہ نے، کیونکہ میں دنیا کی اس زبان میں گفتگو کر رہا تھا جہاں سے میں آیا تھا۔

ساتویں دن جب میرا عقیقہ ہوا تو کھانے کے بعد مُلّا نے میرے لئے دعا مانگی کہ میں مسلمان رہوں اور اسلام ہی پر میرا خاتمہ ہو۔ میں نے اپنی زبان میں اس سے کہا کہ "اگر مسلمان ایسا ہی ہوتا ہے جیسا تو ہے، تو خدا نہ کرے میں مسلمان رہوں اور اسلام پر میرا خاتمہ ہو"۔ لیکن کسی نے کچھ نہ سمجھا اور میں خاموش ہو گیا

سات ماہ کے بعد ایک نجومی آیا اور اس نے میرا زائچہ دیکھ کر حکم لگایا کہ "میں بڑا زبردست عالم دین ہوں گا اور ہزاروں آدمی میرا اتباع کریں گے"۔

یہ سنکر میں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخکر کہا کہ "یہ پیشین گوئی بالکل غلط ہے کیونکہ مجھے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ میں سوائے گانے کے اور کچھ نہ سیکھوں گا"۔ —— ان واقعات پر تیس سال گزر گئے ہیں میری ماں بھی مر چکی ہے اور دایہ و مُلا بھی، لیکن نجومی ابتک زندہ ہے۔ کل بازار میں اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا میرا مشغلہ کیا ہے میں نے کہا کہ "نقاشی سیکھ رہا ہوں"۔ اس نے مسکرا کر کہا کہ "میں جانتا تھا کہ تم اپنے زمانہ کے بڑے ماہر نقاش ہو گے اور میں نے تمھاری ماں سے بھی یہی پیشین گوئی کی تھی، میں یہ سنکر خاموش ہو رہا کیونکہ میں خود اُس دنیا کی زبان بھول چکا تھا۔

مطبوعات موصولہ

کلام جوہر مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جسے جامعۂ ملیہ دہلی نے نظر ثانی کے بعد اس نام سے شائع کیا ہے۔ مولانا محمد علی ان لوگوں میں سے تھے جو دنیا میں سب کچھ بننے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فی الحقیقت کس کام کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے جس طرح سیاسیات و خطابت میں خاص شہرت حاصل کی اسی طرح انھوں نے بہ حیثیت ایک شاعر و انشاپرداز کے بھی لوگوں کے دلوں میں جگہ کر لی تھی اور یہ مجموعہ ثبوت ہے ان کی شاعرانہ اہلیت کا۔ مولانا ہر چند فطرتاً شاعر پیدا نہ ہوئے تھے جیسا کہ ان کے کلام کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن اکتساباً جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ بھی اتنا دلکش ہے کہ ان کی قوت نظم کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس مجموعہ میں چند نظمیں بھی ہیں جن میں سوائے اس کے کوئی خاص بات نہیں کہ وہ خاص موقعہ و محل پر لکھی گئی ہیں اور تاثرات سے بیگانہ نہیں ہیں۔ چند غزلیں ابتدائی دور کی ہیں جو جذبات و قدرت نظم دونوں حیثیت سے واقعی ابتدائی مشق کی معلوم ہوتی ہیں اس کے بعد اصل دیوان ردیف وار شروع ہوتا ہے جس میں بعض اشعار واقعی نہایت پاکیزہ ہیں مثلاً:۔

ہیں شوق کی اگر یہی امیدواریاں — نوبت کب آئے دیکھئے گفت و شنید کی
وہی دن ہے ہماری عید کا دن — جو تری یاد میں گزرتا ہے
نہ بھائے گا تمھیں قصہ عزیز و عیش رفتہ کا — پہ کیا کیجے ہمیں تو اک یہی افسانہ آتا ہے
نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر — کام کرنے کا یہی ہے، تمھیں کرنا ہے یہی
تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں

چونکہ مولانا کا یہ دیوان محض ان کا تفنن طبع ہے نہ کہ شاعرانہ ادعا اسلئے ان اسقام و اغلاط کا ذکر فضول ہے جو اس مجموعہ میں نظر آتے ہیں۔ شروع میں عبدالماجد دریابادی کا لکھا ہوا مقدمہ بھی ہے جس کا قابل اعتنا حصہ صرف اس قدر ہے جو سیرۃ محمد علی سے تعلق رکھتا ہے، شاعری سے چونکہ عبدالماجد صاحب کو خود کوئی لگاؤ نہیں ہے اس لئے مناسب یہی تھا کہ وہ اس باب میں خاموشی اختیار کرتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور آخر کار ہر جگہ انھوں نے ٹھوکر کھائی۔ مقدمہ نگار کی بدذوقی اور "تحسین ناشناسی" کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ جوہر کے منتخب اشعار میں ذیل کے شعر کو بھی جگہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حنا کا قافیہ کیا

خوب باندھا ہے

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے ۔۔۔ میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اس مجموعہ کی قیمت ۸ر ہے۔

بانگ جرس مختصر سا مجموعہ ہے جناب شفیق جونپوری کے کلام کا جس میں نظمیں، قطعات، رباعیات وغیرہ بھی کچھ شامل ہے، غزلوں کا حصہ کم ہے۔ شفیق صاحب مولانا حسرت موہانی کے شاگرد ہیں اور جس حد تک تغزل کا تعلق ہے وہ یقیناً اپنے اُستاد کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں

خوب سوچا تو نہ نکلا کوئی دشمن اپنا ۔۔۔ ان کی پہلی نظر لطف وعنایت کے سوا

سرورِ عشق ومحبت ہے جانِ مستی ہے ۔۔۔ شراب حسن میں ڈوبا ہوا شباب ان کا

نشانِ رفتگاں پاکر بڑھی اور اپنی بیتابی ۔۔۔ بہت رویا کئے دامن میں گرد کارواں لیکر

شفیق صاحب نے رنگ حسرت کے تتبع کی پوری کوشش کی ہے اور ایک حد تک انھیں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اتنی جلدی انھیں مجموعہ کی اشاعت کی کیوں تھی علی الخصوص ایسی حالت میں کہ ان کا کلام اسقام واغلاط سے پاک بھی نہیں ہے۔ علاوہ غزلوں کے اور جو کچھ ہے وہ یکسر ناقابل توجہ ہے (اور بدقسمتی سے بہت کچھ وہی ہے) لکھائی چھپائی بھی اچھی نہیں ہے۔ قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ۔ دفتر برق جونپور۔

خمکدۂ سرور سرور جہان آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے قاضی محمد غوث صاحب فضا حیدر آبادی نے شایع کیا ہے۔ سرور ان شعراء میں سے تھے جنھوں نے موجودہ دورِ شاعری کی طرح ڈالنے میں حصہ لیا تھا اور جن کی خدمات کو اُردو زبان کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اس سے قبل ان کا مجموعۂ کلام جام سرور اور خمخانۂ سرور کے نام سے زمانہ پریس کانپور اور انڈین پریس الہ آباد شائع کر چکے ہیں، لیکن یہ ضرور نہیں کہ سرور ایسے شاعر کا ذکر بار بار نہ کیا جائے۔ سرور کے کلام کی مستی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی اور دنیا کو کوئی حق حاصل نہیں کہ اسے فراموش کردے۔

غوث صاحب نے کوشش کی ہے کہ سرور کا تمام کلام اس مجموعہ میں آجائے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ابتدا میں چند مقالات بھی دیدئے گئے ہیں، جن سے سرور کے حالات زندگی اور اُن کے رنگ سخن پر روشنی پڑتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ طباعت وکتابت کے لحاظ سے یہ مطبوعات حیدر آباد میں شامل کرنے کے قابل نہیں۔ قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

مرثیۂ اُندلس حصۂ اول جناب حفیظ نعیمی بیلی بھیتی نے اُندلس کے عہد اسلامی اور اس کے زوال کی

تاریخ کو اس نام سے نظم کیا ہے۔ لیکن ابتدا کی ہے تخلیق آدم سے۔ اشعار میں کافی جوش ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے جو کچھ لکھا ہے وہ شدید تاثر کے ساتھ لکھا ہے اور کسی نظم کی خوبی کی یہی دلیل ہوسکتی ہے۔

ابتدا میں جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کا مقدمہ ہے جس میں حفیظ صاحب کے حالات، اور انکی شاعری پر نقد کیا گیا ہے۔ ان کے بعد مولوی محمد خلیل الرحمان صاحب مولف اخبار الاندلس کا ایک تاریخی مقالہ ہے جنھوں نے تاریخ اسپین پر ماہرانہ تبصرہ فرمایا ہے۔ نظم کی نوعیت اور ناظم کے انداز بیان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان شاعر کا مستقبل بہت کچھ امکانات اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے اور یقیناً افسوسناک واقعہ ہوگا اگر یہ امکانات بروئے کار نہ آئے۔

یہ کتاب مصنف سے ایک روپیہ میں ملسکتی ہے اور خط وکتابت کا پتہ موضع کرگھناں ڈاکخانہ امریا ضلع پیلی بھیت۔

مضامین فلک پیما مجموعہ ہے میاں عبدالعزیز ام۔ اے لاہوری کے ان مضامین کا جو ہمایوں میں "فلک پیما" کے نام سے شایع ہوئے ہیں۔

"فلک پیما" اُردو کے اُن انشاپردازوں میں سے ہیں جنھوں نے بغیر کسی سعی وکاوش کے "انفرادیت" حاصل کرلی ہے اور جن کی "ادبیت" چھٹی حس کی طرح ہر وقت اور ہر جگہ کام کرتی رہتی ہے۔

ایک ادبی مقالہ کا حُسن "ندرتِ خیال" سے اتنا تعلق نہیں رکھتا جتنا "ندرتِ بیان" سے لیکن اگر دونوں کا کسی جگہ اجتماع ہوجائے تو پھر یوں سمجھئے کہ وہ "نفخ صور" سے کم نہیں۔ میرے نزدیک "فلک پیما"، بھی انھیں صور پھونکنے والے ادیبوں میں شامل ہیں۔ ان کا خیال، دماغ کی جن راہوں سے گزر کر صفحۂ کاغذ پر آتا ہے وہ ایسی ہیں جو اول تو عام دماغوں میں پائی نہیں جاتیں اور اگر پائی بھی جائیں تو ان سے کام لینے کا سلیقہ شاذونادر ہی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ حیاتِ انسانی کا مفہوم ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ

"زندگی کا لباس غرور سے پہنو، جیسے کوئی بادشاہ تاج پہنتا ہے"

اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اسی غرور و پندار سے لکھا ہے۔

ان کی انشاپردازی کی ایک اور نمایاں خصوصیت اس کا وہ مخصوص "مزاحی رنگ" ہے کہ اگر کوئی اس سے خوش ہونا چاہے تو تبسم کیا قہقہہ کی بھی کمی نہیں اور اگر کوئی بُرا مانے تو گالیاں دینے کے بعد بھی تسکین نہیں ہوتی (ملاحظہ ہوں فلک پیما کے وہ مقالات جن میں انھوں نے مذہبی مفروضات اور مولویوں کے مزخرفات سے بحث کی ہے)

فلک پیما، صرف "مژدۂ بہار" سنانا چاہتا ہے اور "خبر بد" سنانے کی خدمت صرف مولوی وصوفی کیلئے موزوں سمجھتا ہے۔ وہ دنیا اور اس کے ہنگامہ کو بالکل "افادی" نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور سوائے مسرت ونشاط کے نہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے نہ سننا۔ ان کے ہر فقرہ سے امنگ ٹپکتی ہے اور ان کے ہر خیال سے

ولولہ انبساط۔ الغرض وہ ایک زندہ مضمون نگار ہے جو ہمیں صرف زندگی کا درس دینا چاہتا ہے اور موت کو "صید زبوں"، جانکر اس کی طرف نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔

اس مجموعہ میں سو کے قریب ان کے مقالے شامل ہیں اور ہر مقالہ بجائے خود اس قدر دلچسپ ہے کہ ساری کتاب بالکل "خاصہ" کی چیز نظر آتی ہے۔ طباعت وکتابت نہایت پاکیزہ ہے اور حجم ۳۸۰ صفحات۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالۂ ہمایوں لاہور۔

شاخ نبات مجموعہ ہے جناب طالب باغپتی کے کلام کا جس میں نظمیں، غزلیں اور رباعیاں ان کی یکجا نظر آتی ہیں۔ شروع میں جناب نواب محمد جمشید علی خالصاحب رئیس باغپت کا مقدمہ ہے اس کے بعد جگر مرادآبادی کا تبصرہ اور پھر اصل کلام۔

پہلا حصہ سو صفحات کا نظموں کے لئے وقف ہے جس میں سوائے دو ابتدائی نظموں کے (کہ ان میں سے ایک حمد کی ہے اور دوسری نعت کی) باقی تمام حسن وعشق سے تعلق رکھتی ہیں۔ چونکہ طالب صاحب کا اصل ذوق "غزلگوئی" ہے، اس لئے ان کی نظمیں بھی اس رنگ سے خالی نہیں اور بہت کیف آور ہیں۔ "سحر نغمہ" کے ابتدائی تین شعر ملاحظہ ہوں:۔

راگنی کے روپ میں اک کافرہ گیسو دراز — سوہنی کے بھیس میں اک ساحرہ بربط نواز
کمسنی کی شکل میں رعنائی دورِ شباب — پیکر دوشیزگی میں ایک ہلکی سی شراب
ہاتھ میں بربط گلے میں لحنِ داؤدی لئے — سحر نغمہ گوش بر آواز صحرا کو کئے

یہ ہے اصل رنگ طالب صاحب کا جس سے ان کی کوئی نظم بھی خالی نہیں چہ جائیکہ غزل۔

رنگِ تغزل کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

اب ترے انتظار میں سمجھا — عمر کتنی دراز ہوتی ہے
ہم سے بھی پوچھو شب غم کس طرح کٹی — تجھنے تو کہدیا کہ "ہمیں نیند آگئی"
روک دیتا ہے ترے موج تبسم کو حجاب — یا کسی سر بند شیشے میں مچلتی ہے شراب

رباعیاں بھی اچھی ہیں۔ یہ مجموعہ غیر مجلد ۱۲ میں اور مجلد ۱۴ میں مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے ملسکتا ہے۔

اسلام کی حکیمانہ زندگی مجموعہ ہے ان مواعظ کا جو مولانا علی نقی صاحب نے گزشتہ عشرۂ محرم کے دوران میں ارشاد فرمائے۔ چونکہ مولانائے موصوف کے متعدد رسایل وتصانیف پر بارہا نگار میں اظہار خیال کیا جاچکا ہے، اس لئے قارئین نگار آپ سے ناواقف نہیں ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اپنے فاضل دوست کی تمام تصانیف کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

مولانا کی اکثر تصانیف بہ سلسلۂ تبلیغ امامیہ مشن شایع ہوتی ہیں، لیکن ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ ان تصانیف کی "افادیت" صرف شیعہ طبقہ کے لئے مخصوص و محدود ہوتی ہو۔ وہ زیادہ تر اصولی مباحث کو سامنے رکھتے ہیں اور اصول ہی کو پیش نظر رکھ کر اظہار خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ عشرۂ محرم کے یہ تمام مواعظ بھی اسی خصوصیت کے حامل ہیں جن میں انسانی زندگی، تعلیمات مذاہب، حریت عقل، قوت عمل، نظام اجتماعی وغیرہ نہایت اہم مسایل سے بحث کی گئی ہے۔ زبان و انشار کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے کیونکہ اس خصوص میں مولانا کو جو شہرت حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بعض بعض جگہ فرعی مباحث یا طریق استنتاج میں مجھے مولانا سے ضرور اختلاف ہے لیکن وہ اتنا زیادہ اہم نہیں کہ اس کا اظہار ضروری ہو۔

اس کتاب کی قیمت ۸ ر ہے اور سکریٹری صاحب امامیہ مشن لکھنؤ سے ۸ ر میں مل سکتی ہے۔

فن زراعت ملک مالوہ تصنیف ہے مولوی محمد ضیاء الدین حیدری کی جو زراعت و فلاحت کے ماہر ہیں اور جن کی زندگی کا تمامتر حصہ اسی مشغلہ میں بسر ہوا ہے۔ آپ جس زمانہ میں بھوپال کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر زراعت تھے اس زمانہ میں آپ کو سرزمین مالوہ اور وہاں کی خصوصیات کاشت کے مطالعہ کرنے کا زیادہ موقعہ ملا جو اس تصنیف کا باعث ہے۔

اس کتاب میں زمین کی قسموں، طیاری زمین کے طریقوں، تخم ریزی کے اصول، آبپاشی کے وسایل اور اجناس ربیع و خریف کی تفصیلات سے بحث کر کے نہایت آسان زبان میں تمام وہ ذرایع قلمبند کر دئے گئے ہیں جو ایک کاشتکار کو پیداوار کی ترقی میں مدد دے سکتے ہیں۔ زبان نہایت سادہ و سلیس ہے تاکہ ہر شخص اسے سمجھ سکے۔ یہ دوسرا اڈیشن ہے اور اس کی قیمت ۱۲ ر ہے۔ ملنے کا پتہ محلہ قاضی گڑھی کاکوری ضلع لکھنؤ اور مصنف کا نام۔

"نگار" جنوری ۳۷ء

اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل جدید چیز ہوگا اور مفید ہونے کی حیثیت سے حد درجہ اہم۔

علوم و فنون اور ادب و انشار کے متعلق اتنے مفید و دلکش مضامین کا مجموعہ مشکل ہی سے آپ کو کہیں اور نظر آسکتا ہے۔

"ڈرامہ اصحاب کہف"

بھی مکمل اسی میں شایع ہوگا اور علاوہ اس کے اور بھی اکثر مضامین اڈیٹر کے قلم کے ہوں گے۔ ضخامت بھی دوچند ہوگی۔

منیجر نگار - لکھنؤ

دیہات کی شام

جھٹپٹے میں شام کے ہے آسماں کھویا ہوا / جیسے دن بھر کا مسافر ہو کوئی سویا ہوا
گر رہا ہے یوں افق سے رنگ بالائے زمیں / جیسے سجدے میں کسی مومن کی جھکتی ہو جبیں،
سو چلا ہے مضطرب ذروں کا وردِ مستقل / جس طرح آسودۂ آغوش ہو شاعر کا دل
نسترن کے کنج میں ٹھیرے ہوئے ہے رنگ و بو / ڈوبتی کرنوں سے رنگیں تتلیوں کی گفتگو
نازپرور کھیتوں میں لہلہاتی سی بہار / جس طرح جنت بداماں مطمئن دل کا قرار
بیریا کا پیڑ ٹھہراتا ہے کانٹوں میں اسیر / جیسے زاہد کا شکیب اور جیسے مجرم کا ضمیر
دورِ سنبل میں مصور کی نظر اُلجھی ہوئی / جیسے پھولوں میں کہیں دب جائے کوئی تیتری
نرم جاں پودے سکوں کی گود میں مست شباب / جیسے دیکھیں بلبلیں ہنستے ہوئے پھولوں کے خواب
خشک کانٹوں کی زباں پر زندگانی کا پیام / آشیاں بھولے ہوئے طائر کا شاخوں میں قیام
ہلکی ہلکی سی ہوا سرگوشیاں کرتی ہوئی / گلستاں کی غنچگی میں بجلیاں بھرتی ہوئی
رہگذر کے پاس اک جھاڑی میں جگنو کی چمک / قلبِ ہستی میں ہو جیسے نورِ عرفاں کی جھلک
فاصلے پر ہلکا ہلکا جھلملاتا اک چراغ / کفر کی گمراہیوں میں جیسے ایماں کا دماغ

اک پرانے پھوس کے چھپر میں بیٹھا ہو کسان / رنگ و بو کی مملکت کا بادشہ، کھیتوں کی جان
انگلیوں سے دیکھتا رہتا ہے نبضِ کائنات / بادلوں سے کھیلتا ہے، برق سے کرتا ہے بات
اس کے کس بل پر اکڑتا ہے سیاست کا دماغ / خون سے جلتا ہے اس کی شہریاری کا چراغ
یہ پھٹے کپڑے، یہ میلے پاؤں، یہ بخت سیاہ / دیکھ لے تو زندگی کے دل سے بھی نکلے اک آہ
عمر کی گہرائیوں میں کھوئی جاتی ہے نگاہ / ابر کے دامن میں جیسے لے کبھی سورج پناہ
بزمِ اسرارِ حقیقت کا دوامی رازدار / زندگی کے تیز کانٹوں پر ہمیشہ بیقرار
رنگ دنیا بھی اگر کروٹ بدلتا ہے کبھی / سب سے پہلے زد میں آتی ہے اسی کی جھونپڑی
ساری دنیا کو کھلائے اور خود بھوکا مرے / سب کو روٹی دے، خود اپنا پیٹ پتھر سے بھرے
علم کی گمراہ کن کرنوں سے یہ بیگانہ ہے / سب کی قسمت کے ستم سہلے یہ وہ دیوانہ ہے

کردگارِ صبحِ ہستی! داورِ کون و فساد! / کب مٹے گا فطرت و انساں کی حالت کا تضاد!
ننگِ نظارہ بنا جاتا ہے انساں ہائے ہائے!
تیرگی سے ابد و اس منظر کو جلد آ کر چھپائے

فضل الدین اختر

عشق

پھر رہا ہے عشق اپنی دُھن میں لہراتا ہوا — وحشتِ کہنہ کے ہر قصّے کو دُہراتا ہوا
شاعروں کے دِل جلا کر نطق کی قندیل میں — حُسن کی پُرتمکنت محفل کو گرماتا ہوا
حُسن کی پُرتمکنت محفل کو گرما کر ندیم — جھومتا، ہنستا، مچلتا، لغزشیں کھاتا ہوا
موت کی سرد اور بے رونق جبیں کو دیکھ کر — روح پرور قہقہوں کی آگ برساتا ہوا
چند صد ریزہ گریبانوں کے سرمائے کے ساتھ — دو جہاں پر پرچمِ تسخیر لہراتا ہوا
ہر شکستِ لازمی پر طنز سے ہنستا ہوا — ہر یقینی ہار پر فتحِ مبیں پاتا ہوا
جینے مرنے کے سلیقوں کا خدا، ہر گام پر — زندگی اور موت کے رازوں کو سلجھاتا ہوا
کلفتوں سے درسِ عیشِ جاوداں لیتا ہوا — فخر سے ہنس ہنس کے بے اندازہ غم کھاتا ہوا
مضمحل روحوں کو دیکر جھوم اُٹھنے کا پیام — سرد و پژمردہ دلوں کو وجد میں لاتا ہوا
حاصلِ کون و مکاں، ہنگامۂ ہستی کی جاں — وسعتِ کونین پر ہر رنگ میں چھاتا ہوا

التہابِ عشق کو اس سے جدا کر دیں اگر!
زندگی ہے اے عدمؔ اک پھول مرجھاتا ہوا

عدم

مصری جدید بُرقعہ

آج کل بھی مصر کے شاہی خاندان میں اس بُرقعہ کا استعمال رائج ہے۔ خوبصورت۔ وضعدار زمانۂ حال کے موافق پردہ کا پورا محافظ ہے آج ہی کمر سے پیر کے ٹخنہ تک ناپ روانہ کریں۔ ناپسند ہونے پر قیمت واپس۔ قیمت سوتی رنگین چھ روپے۔ لٹری دس روپے۔

سلک پندرہ روپے

خاتون اسٹور۔ چاندنی چوک دھلی

نوازشِ فطرت

فلک سے سورج کی حشر خیز آتشیں شعاعیں برس رہی تھیں   زمیں سے لیکر وہ آسماں تک ہر ایک شے کو جھلس رہی تھیں
جہاں کا ایک ایک ذرہ حدت کے ظلم سے بلبلا رہا تھا   فضائے ہستی میں ایک طوفانِ آتشیں تلملا رہا تھا
وہ جوش تھا سیلِ آتشیں کا زمین بھی آگ اُگل رہی تھی   وہ زور تھا شعلہ خیزیوں کا کہ روحِ دوزخ دہل رہی تھی
سکوت ہر ذی حیات پر اک طلسم سا بنکے چھا رہا تھا   جہاں کے اس آتشیں نظارے کی ہولناکی بڑھا رہا تھا

کسان اس قہر کی تپش میں بھی کھیت میں ہل چلا رہے تھے
نشے میں ڈوبے ہوئے تھے اور اپنی دُھن میں گیت گا رہے تھے

یکایک اک نوجوان لڑکی ہوئی عیاں دامنِ جبل سے   غبار اُٹھا دھوئیں کی مانند ناگہاں دامنِ جبل سے
عرق عرق جسم اس کا اور ہانپتی ہوئی بیقرار لڑکی   جلی ہوئی دھوپ کی تمازت سے مضمحل دلفگار لڑکی
جبیں سے تھی سادگی نمایاں، لباس سے مفلسی ہویدا   گٹھے ہوئے جسم سے مشقت کی تندرستی کی شان پیدا
حسین چہرے کی فکرمندی سے صاف غربت ٹپک رہی تھی   برہنہ پائی میں آہ تقدیر کی نوازش جھلک رہی تھی

غرض کسانوں کے واسطے کھانا لیکے گاؤں سے آ رہی تھی
خلافِ معمول دیر ہونے سے رُخ پہ زردی سی چھا رہی تھی

اُدھر تھے بیتاب بھوک سے، اس کے منتظر کاشتکار بندے   جہاں کے پروردگار، خلقِ خدا کے خدمتگزار بندے
اِدھر بچاری کو ایک زہریلے سانپ نے راستے میں کاٹا   تڑپ اُٹھی فرطِ درد سے وہ مگر مناسب نہ تھا ٹھہرنا

قدم سوئے منزل اور تیزی سے بیقراری میں بڑھ رہا تھا
نگاہ کچھ بہکی جاتی تھی اور جسم میں زہر چڑھ رہا تھا

وہ آکے پہونچی، وہ کھانا رکھا، وہ ہوکے بیہوش گر گئی ہے   حیات نے اپنا رشتہ توڑا، نگاہِ تقدیر پھر گئی ہے

زباں پہ اُف تک آنے پائی کہ گود میں لے لیا اجل نے
چراغِ ہستی کو چند لمحوں میں آہ گُل کر دیا اجل نے

انجم رضوانی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت علاوہ محصول عار

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاءِ عالیہ سحرِ حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے

قیمت علاوہ محصول عمر

فراست الید

مؤلفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل عروج و زوال موت حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشنگوئی کر سکتا ہے

قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشاط بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں ملسکتی۔

قیمت دس آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں

قیمت علاوہ محصول ۱۲

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ یادئین کا مذہب

۳۔ حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہگئی ہیں۔

قیمت (۱۲ار) علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی اُمیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے

قیمت (۸/عہ) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جسمیں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدنی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کے تمدن و شائستگی اسکی کسقدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت ۶ر

علاوہ محصول۔

صحابیات

اسمیں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دئیے گئے ہیں اسکا مقدمہ جسے مؤلف خاص نے انشاء میں لکھا ہے دیکھنے کے قابل ہے اس موضوع پر اور کتابیں بھی غیر مصنفین کی موجود ہیں لیکن اتنی صحابیات کے حالات کسی کتاب میں درج نہیں کئے گئے ہیں۔ قیمت عار

علاوہ محصول۔

المسئلۃ الشرقیہ

مصطفےٰ کامل پاشا کی اس مشہور عالم کتاب کا ترجمہ ہے جسنے یورپ و ایشیا کی سیاسیات میں ہلچل ڈالدی تھی اور جسنے سب سے پہلے ترکی و مصر و عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونک کر عالم اسلامی کے درخشاں مستقبل کو بے نقاب کر دیا تھا۔

قیمت ۶ر

علاوہ محصول۔

عرض نغمہ

یعنی ٹیگور کی گیتان جلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جسکے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کی رائے تھی کہ دنیا کی کسی زبان میں گیتان جلی کا ترجمہ اس سے بہتر نہیں کیا گیا۔ اسکے شروع میں ایک نہایت ہی لطیف مقدمہ بھی شامل ہے قیمت غیر مجلد عمر

علاوہ محصول

شاہی
تیار کردہ
طیبی
دواخانہ
یونانی

شاہی
تیار کردہ
طیبی
دواخانہ
یونانی

ملیریا اور ٹائیفائیڈ (موتی جھرہ)
کے بعد کمزوری دفع کرنے کیلئے
"شاہی"
لاجواب دوا ہے

ہسٹریا اور اسقاط حمل
کے
دفع کرنے میں
"شاہی"
کا مقابلہ کرے ایسی
دوا شاذونادر
ہی ہو

اینیمیا (کمی خون) دمہ
کھانسی وجملہ امراض
سینہ کے لئے
"شاہی"
اکسیر علاج
ہے

مزید معلومات کے لئے
مفت رنگین رسالہ
مفت طلب کیجئے

طیبی دواخانہ یونانی

اندور (مالوہ)
تار کا پتہ :- "شاہی" اندور

۶۶ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳
ٹیلیفون نمبر ۲۴۹۸۳